جلد ۵ عدد ۵
ذی القعدہ ۱۳۵۴ھ

رجسٹر نمبر آصفیہ ۱۲
رجسٹر نمبر ایم (۲۹۵۰)

۴۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (۵ صہ)

قیمت فی پرچہ ۸ر

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابوالاعلیٰ مودودی

کتاب کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے اسکے ابتدائی تین ابواب کی فہرست مضامین ملاحظہ ہو

(۱) **اسلامی جہاد کی حقیقت** - انسانی جان کا احترام - دنیا پر اسلامی تعلیم کا اخلاقی اثر - قتل بالحق و قتل بالحق و بغیر حق کا فرق - ناگزیر خونریزی - اجتماعی فتنہ اور اس کا علاج - جنگ ایک اخلاقی فرض - جنگ کی مصلحت - جہاد فی سبیل اللہ کے معنی - حق و باطل کی حدبندی - جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت - فضیلت جہاد کی وجہ - نظام تمدن میں جہاد کا درجہ

(۲) **مدافعانہ جنگ** - دفاع کی ضرورت و اہمیت - دفاع ایک مذہبی فریضہ - مدافعانہ جنگ کی صورتیں:- (۱) راہ حق کی حفاظت (۲) عقد و عہد شکنی کی سزا (۳) گھر کے بھیدیوں اور اندرونی دشمنوں کا استیصال (۴) دارالاسلام کے امن کی حفاظت (۵) مظلوم مسلمانوں کی حمایت - دفاع کی اصلی غرض - استعداد قوت کی دائمی تاکید-

(۳) **مصلحانہ جنگ** - مسلمانوں کی زندگی کا اصلی مقصد - اجتماعی فرائض کا اخلاقی تصور - اجتماعی فرائض کا اسلامی تصور - امر بالمعروف و نہی عن المنکر - حیات اجتماعی میں اس کا درجہ - امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرق - نہی عن المنکر کا طریقہ - فتنہ و فساد کے خلاف جنگ - فتنہ کی تحقیق - فساد کی تحقیق - حکومت الٰہی کے قیام کی ضرورت - قتال کا حکم - قتال کی غرض و غایت - جزیہ کی حقیقت - قتال کی آخری حد - اسلام اور جہانگیری - اسلامی فتوحات کی توجیہہ - حکومت صرف صالحین کا حق ہے۔

قیمت { بلا جلد للعہ سکہ انگریزی للعہ ۱۲ سکہ عثمانیہ
مجلد صہ ،، ،، صہ ۱۲ ،، ،،

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے

فہرست مضامین

ماہ ذی القعدہ سنہ ۱۳۵۳ھ جلد ۵ عدد ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

قوم دو طبقوں پر مشتمل ہوا کرتی ہے۔ ایک طبقۂ عوام، دوسرا طبقۂ خواص۔ طبقۂ عوام اگرچہ کثیر التعداد ہوتا ہے، اور قوم کی عددی قوت اسی طبقہ پر مبنی ہوتی ہے، لیکن سوچنے اور رہنمائی کرنے والے دماغ اس گروہ میں نہیں ہوتے۔ نہ یہ لوگ علم سے بہرہ ور ہوتے ہیں، نہ ان کے پاس مالی قوت ہوتی ہے، نہ یہ جاہ و منزلت رکھتے ہیں، نہ حکومت کا اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ اس لیے قوم کو چلانا ان لوگوں کا کام نہیں ہوتا، بلکہ محض چلانے والوں کے پیچھے چلنا ان کا کام ہوتا ہے۔ یہ خود راہیں بنانے اور نکالنے والے نہیں ہوتے بلکہ جو راہیں ان کے لیے بنا دی جاتی ہیں انہی پر چل پڑتے ہیں۔ راہیں بنانے اور ان پر پوری قوم کو چلانے والے دراصل خواص ہوتے ہیں، جن کی ہر بات اور ہر روش اپنی پشت پر دماغ، دولت، عزت اور حکومت کی طاقتیں رکھتی ہے، اور قوم کو طوعاً و کرہاً انہی کی پیروی کرنی پڑتی ہے۔ پس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ قوم کی اصلی طاقت اس کے عوام نہیں بلکہ خواص ہوتے ہیں۔ انہی پر قوم کے بننے اور بگڑنے کا مدار ہوتا ہے۔ ان کی راست روی پوری قوم کی راست روی اور انہی کی گمراہی پوری قوم کی گمراہی پر منتج ہوتی ہے۔ جب کسی قوم کی بہتری کے دن آتے ہیں تو ان میں ایسے خواص پیدا ہوتے ہیں جو خود راہ راست پر چلتے اور پوری قوم کو اس پر چلاتے ہیں۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ (۲۱: ۵)۔ اور جب کسی قوم کی تباہی کا زمانہ آتا ہے تو اس کے بگاڑ کی ابتدا اس کے خواص سے ہوتی ہے، جن کی گمراہی اور فساد اخلاق سے آخر کار ساری

قوم ضلالت اور بدعملی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا (۱۷: ۲)

قرآن نے خواصِ قوم کو "مُترَفین" کہا ہے، یعنی وہ لوگ جن کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے خوب سرفراز کیا ہو۔

اللہ کی سنت کے مطابق ہماری قوم کا بگاڑ بھی ہمارے مترفین ہی سے ہوا۔ ان لوگوں نے اُس طریقے کو جو احکام الٰہی کے مطابق ہدایت کرنے والے ائمہ کا طریقہ تھا چھوڑ دیا اور شیطانی طریقوں کی پیروی شروع کر دی۔ انہی نے نفس پرستی کے لیے شریعت کی بندشیں ڈھیلی کرنے کا سلسلہ شروع کیا، انہی نے فراعنہ اور قیاصرہ کی طرح خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرانی شروع کی اور اپنی قوم کو خدا پرستی کی جگہ بادشاہ پرستی اور امرا پرستی کا خوگر بنایا، انہی نے ان گردنوں کو بندوں کے آگے جھکنا سکھایا جنھیں صرف خدا کے آگے جھکنے کی تعلیم دی گئی تھی، انہی نے خوشنما لباسوں اور شاندار محلوں میں معاصی اور جرائم کا ارتکاب کر کے اپنی قوم کے لیے معاصی و جرائم کو خوش نما بنایا، انہی نے حرام کے مال کھا کر اپنی قوم کو حرام کھانے اور حرام کھلانے کی عادت ڈالی، انہی نے علم کو ضلالت کے لیے، عقل و فکر کو شرارت کے لیے، ذہانت کو مکر و فریب اور سازشوں کے لیے، دولت کو ایمان خریدنے کے لیے، حکومت کو ظلم و جور کے لیے، اور طاقت کو تکبر کے لیے استعمال کیا، پھر یہی ہیں جنھوں نے حقوق اور منافع تک پہنچنے اور ترقی کرنے کے اکثر جائز راستے بند کر دیے اور لوگوں کو مجبور کر دیا کہ خوشامد، رشوت، جھوٹ، سازش اور ایسے ہی دوسرے ذلیل راستوں سے اپنے مقاصد کو پہنچیں۔ غرض اخلاق و اعمال کا کوئی فساد ایسا نہیں ہے جس کا آغاز ان مُترَفین سے نہ ہوا ہو۔ ان کو اللہ نے جو نعمتیں عطا کی تھیں ان کو انھوں نے غلط طریقوں سے استعمال کیا، خود بھی بگڑے، اور اپنے ساتھ اپنی قوم کو بھی بگاڑا۔

یہ سب کچھ صدیوں سے ہو رہا تھا، اور اخلاقی مفاسد کا گھن مسلمانوں کی قومی طاقت کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا، مگر اس کے باوجود دلوں میں کم از کم ایمان کی روشنی موجود تھی۔ احکام خدا و رسول کی پابندی چاہے نہ ہو مگر خدا و رسول کی عظمت دلوں میں باقی تھی، قانون اسلام کی خلاف ورزی چاہے کتنی ہی کی گئی ہو مگر قانون کے احترام سے دل خالی نہ ہوئے تھے، اسلام کی حکومت سے انحراف خواہ کتنا ہی بڑھ گیا ہو مگر اس کے مقابلے میں بغاوت کی جرأت کبھی نہ ہوئی تھی۔ جس کو اسلام نے حق کہا تھا اس کو حق ہی مانا جاتا تھا، اگرچہ اس کو چھوڑ کر باطل کی پیروی میں کتنا ہی غلو کیوں نہ کیا گیا ہو۔ لیکن یہ جسارت کسی میں نہ تھی کہ اسلام کے بتائے ہوئے حق کو باطل، باطل کو حق، فرض کو لغو و مہمل، جائز کو مکروہ، حرام کو حلال بلکہ مستحسن اور گناہ کو صواب کہا جاتا یا سمجھا جاتا۔ گناہوں کا ارتکاب بےشک ہوتا، جرائم سے بلاشبہ دامن آلودہ ہوتے، شریعت کی حدود سے بہت کچھ تجاوز کیا جاتا، قوانین اسلامی کی خلاف ورزی حد سے گذر جاتی، مگر دل ان پر شرمسار بھی ہوتے تھے، ندامت سے گردنیں جھک بھی جاتی تھیں، کم از کم دل اس کے معترف ہوتے تھے کہ وہ خدا و رسول کی نافرمانی کر رہے ہیں۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ عقائد کی کمزوری اور اعمال کی خرابی کے باوجود مسلمانوں کی تہذیب انہی قوائم و ارکان پر قائم تھی جو اسلام نے تعمیر کیے تھے۔ یونان و ایران کے افکار کی درآمد نے اگرچہ بہت کچھ گمراہی پھیلائی لیکن انھیں کبھی یہ کامیابی نہ ہوئی کہ مسلمانوں کے زاویۂ نگاہ کو پھیر دیتے، ان کی ذہنیت کے سانچے کو اسلام سے بالکل منحرف کر دیتے، اور ان کی عقل و فکر و تمیز کی قوتوں کو یہاں تک متاثر کر دیتے کہ وہ مسلمان کی سی نظر سے دیکھنا اور مسلمان کے سے دماغ سے سوچنا بالکل ہی چھوڑ دیتے۔ اسی طرح تمدن و تہذیب کا ارتقا اگرچہ بیرونی اثرات کے تحت اسلام کی متعین کی ہوئی راہوں سے بہت کچھ منحرف ہوا، لیکن جن اصولوں پر اس تہذیب و تمدن کی بنا رکھی گئی تھی وہ بدستور اس کی بنیاد میں موجود تھے، اور کسی دوسری مخالف تہذیب کے اصولوں نے ان کی جگہ نہ لی تھی۔ مسلمانوں کی تعلیم کا نظام بہت کچھ بگڑا، مگر علوم دینی کو اس میں بہرحال ایک ممتاز جگہ حاصل تھی، اور

کوئی تعلیم یافتہ مسلمان اسلامی عقائد اور احکام شریعت اور قومی روایات سے کم از کم ابتدائی علم سے بے بہرہ نہ ہوتا تھا۔ مسلمانوں کی عملی زندگی پر قانون اسلام کی بندشیں بہت کچھ ڈھیلی ہوئیں، مگر پھر بھی مسلمانوں کے جملہ معاملات پر ایک ہی قانون نافذ تھا، اور وہ اسلام کا قانون تھا۔ غرض تمام خرابیوں کے باوصف مسلمانوں کے تخیلات اخلاق اور اعمال پر اسلام کا ایک گھرا اثر تھا۔ اس کے اصولوں پر وہ یکسوئی کے ساتھ ایمان رکھتے تھے کم از کم ان کے ایمان کی سرحدیں مخالف اسلام اصولوں کو داخل ہونے کا موقع نہ ملتا تھا، اور اخلاق و اعمال کی جو قدریں اسلام نے متعین کی تھیں وہ اس حد تک متغیر نہ ہوئی تھیں کہ بالکل منقلب ہو جاتیں اور ان کے خلاف کچھ دوسری قدریں ان کی جگہ لے لیتیں۔

لیکن انیسویں صدی میں حکومت کو ہاتھ سے کھو دینے کے بعد جب ہماری قوم کے مترفین نے دیکھا کہ حکومت کے ساتھ جاہ و منزلت، عزت و حرمت، مال و منال سب ہی کچھ ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں اور غلامی کی حالت میں ان کو محفوظ رکھنے اور مافات کی تلافی کرنے کا کوئی ذریعہ بجز مغربی تہذیب اور علوم سے آراستہ ہونے کے نہیں ہے، تو ان کی روش میں ایک دوسرا تغیر ہوا جو صحیح معنوں میں محض تغیر ہی نہیں بلکہ ایک "انقلاب" تھا۔ تغیر کے معنی محض بدل جانے کے ہیں، مگر انقلاب الٹ جانے کو کہتے ہیں، اور فی الواقع اس دوسری کروٹ میں وہ ایسے الٹ گئے کہ ان کا قبلہ مقصود الٹ گیا، ان کی ذہنیت الٹ گئی، ان کی نظریں الٹ گئیں، اور ان کا رخ اسلام سے فرنگیت کی طرف پھر گیا جو اسلام کے عین مخالف سمت میں واقع ہوئی ہے۔

یہ انقلاب جب شروع ہوا تو وہ شرمساری اور ندامت آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگی جو قوانین اسلامی سے انحراف کرتے وقت پہلے محسوس کی جاتی تھی، بلکہ سرے سے یہ احساس ہی مٹنے لگا کہ شریعت کی حدود سے تجاوز کرکے وہ کسی گناہ اور کسی جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ شرمندگی و ندامت

کی جگہ ڈھٹائی اور بے حیائی نے لے لی علانیہ ہر قسم کی قانون شکنی کی جانے لگی، اور شرم کے بجائے اس پر فخر کا اظہار ہونے لگا۔ مگر انقلاب کی رو اس حد پر بھی جا کر نہ رکی۔ اب جو باتیں فرنگیت مآب لوگوں کی مجلسوں میں سنی اور دیکھی جارہی ہیں، وہ بے حیائی سے گذر کر اسلام کے خلاف صریح بغاوت کے آثار ظاہر کرتی ہیں۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ ایک شخص جو اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے، وہ اپنے جرم پر نادم ہونے کے بجائے، اس شخص کو الٹا شرمندہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس پرانے قانون کی اب تک پابندی کیے جارہا ہے گویا اب مجرم اور گنہگار وہ نہیں ہے جو اسلامی قانون کو توڑتا ہے، بلکہ وہ ہے جو اس کی پیروی کرتا ہے۔ اب صرف نماز روزے سے پرہیز ہی نہیں کیا جاتا، بلکہ اس پر فخر بھی کیا جاتا ہے، ترک صوم و صلوٰۃ کی تبلیغ کی جاتی ہے، روزے رکھنے اور نمازیں پڑھنے والوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے، یہ امید کی جاتی ہے کہ پابند صوم و صلوٰۃ لوگ (خصوصاً جبکہ وہ تعلیمیافتہ ہوں) اپنے فعل پر اُلٹے شرمندہ ہوں گے، یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نماز روزے کو چھوڑنا نہیں بلکہ اس کی پابندی کرنا وہ عیب ہے جس پر کسی کو شرمندہ ہونا چاہیے، حد یہ ہے کہ اگر کسی نمازی کا کوئی عیب ظاہر ہوتا ہے تو اس کی تمام کمزوریوں کو نظر انداز کر کے کہا جاتا ہے کہ "آخر وہ حضرت نمازی ہیں نا!" یعنی اس سے عیب کے سرزد ہونے کا اصلی سبب کچھ اور نہیں بلکہ صرف وہ عمل ہے جس کو اللہ نے مانع فحشاء و منکر قرار دیا ہے، اور جسے رسول اللہ نے تمام اعمال سے افضل ٹھیرایا ہے!

یہ بغاوت صرف نماز روزے تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ قریب قریب زندگی کے تمام معاملات میں پھیل گئی ہے۔ اب اسلامی احکام کی پابندی کو "ملائیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور "ملائیت" ہمارے نئے زمانے کی اصطلاح میں تنگ نظری، تاریک خیالی، جہالت، دقیانوسیت، اور بے عقلی کے سب سے زیادہ شدید مرکب کا نام ہے۔ گویا یوں سمجھیے کہ راسخ العقیدہ اور متبع شریعت مسلمان کا نام "ملا" ہے، اور "ملا" وہ ہے جو تہذیب اور روشن خیالی سے کوسوں دور ہو، اور مہذب سوسائٹی میں کسی طرح نہ کھپ سکتا ہو!

آج کسی قول یا فعل کی تائید میں یہ دلیل کوئی دلیل ہی نہیں ہے کہ وہ قرآن وحدیث کے مطابق ہے غیر مسلم نہیں بلکہ ایک مسلمان جو بدقسمتی سے "تعلیم یافتہ" اور "روشن خیال" ہوگیا ہے، بلا تکلف قرآن وحدیث کی سند کو رد کر دیتا ہے، اور اس پر ذرا نہیں شرماتا، بلکہ توقع رکھتا ہے کہ اسلامی قانون کی سند لانے والے کو الٹا شرمندہ ہونا چاہیے۔ قرآن وحدیث کا مستند ہونا تو درکنار ہم نے تو یہ حال دیکھا ہے کہ جس بات کو اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے، اس کے خلاف فوراً ایک تعصب سا پیدا ہو جاتا ہے۔ وہی بات اگر عقلی استدلال کے ساتھ پیش کی جائے، یا کسی مغربی مصنف کے حوالے سے بیان کی جائے تو آمنّا وصدّقنا لیکن اسلام کا نام آتے ہی ہمارے فرنگیت مآب "مسلمانوں" کے دماغوں میں اس کے خلاف طرح طرح کے شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں، اور انھیں شک ہو جاتا ہے کہ اس بات میں ضرور کوئی کمزوری ہے۔ گویا اب قرآن وحدیث کی سند ان لوگوں کی نظر میں کسی بات کو قوی نہیں کرتی بلکہ اس کو الٹا کمزور اور محتاجِ دلیل بنا دیتی ہے!

چند سال پہلے تک یہ وبا صرف ہمارے مردوں میں پھیلی ہوئی تھی، اور ہماری عورتیں اس سے محفوظ تھیں کم از کم اسلامی تہذیب کی حد تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ "حرم" وہ آخری جائے پناہ ہے جہاں اسلام اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کی حفاظت کرتا ہے۔ عورت کو جن مصلحتوں کی بنا پر اسلام نے حجاب شرعی میں رکھا ہے ان میں سے ایک بڑی مصلحت یہ بھی ہے کہ کم از کم وہ سینہ نور ایمان سے منور رہے جس سے ایک مسلمان بچہ دودھ پیتا ہے، کم از کم وہ گود کفر وضلالت اور فساد اخلاق و اعمال سے محفوظ رہے جس میں ایک مسلمان بچہ پرورش پاتا ہے، کم از کم اس گہوارے کے اردگرد خالص اسلامی فضا چھائی رہے جس میں مسلمان کی نسل زندگی کی ابتدائی منزلوں سے گذرتی ہے، اور کم از کم وہ چاردیواری بیرونی اثرات سے محفوظ رہے جس میں مسلمان بچے کے سادہ دل و دماغ پر تعلیم وتربیت اور مشاہدات کے اولین نقوش ثبت ہوتے ہیں پس "حرم" دراصل اسلامی تہذیب کا سب سے زیادہ مستحکم قلعہ ہے، جس کو اس لیے تعمیر کیا گیا تھا کہ یہ تہذیب

اگر کبھی شکست کھا کر پسپا بھی ہو تو یہاں پناہ لے سکے، مگر افسوس کہ اب یہ قلعہ بھی ٹوٹ رہا ہے، فرنگیت کی وبا اب گھروں کے اندر بھی پہنچ رہی ہے، ہمارے فرنگیت مآب مترفین اب اپنی خواتین کو بھی کھینچ کھینچ کر باہر لا رہے ہیں تاکہ وہ بھی انہیں زہریلے اثرات سے متاثر ہوں جن سے خود وہ مسموم ہو چکے ہیں، اور ہماری قوم کی لڑکیاں اب ان تعلیم گاہوں میں گمراہی اور بداعتقادی اور فساد اخلاق اور فرنگی تہذیب کے سبق لینے کے لئے بھیجی جا رہی ہیں جو اس سے پہلے ہمارے لڑکوں کو یہ سب کچھ سکھا کر اسلام سے باغی بنا چکی ہیں۔

یہ آخری حرکت ہمارے نزدیک اس انقلاب کی تکمیل کر دینے والی ہے جس کا ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ ہمارا صرف قیاس نہیں ہے، بلکہ تکمیل انقلاب کے آثار کو یہ بدنصیب آنکھیں دیکھ چکی ہیں، اور یہ بدقسمت کان سن چکے ہیں۔ اب یہ نوبت پہنچی ہے کہ ایک مسلمان عورت قرآن و حدیث کے صریح احکام کی خلاف ورزی کر کے، اپنی زینت کا اظہار کرتی ہوئی نکلتی ہے، انگریزی ہوٹلوں میں جا کر لنچ اور ڈنر کھاتی ہے، سینما ہال میں جا کر مردوں کے درمیان بیٹھتی ہے، بازاروں میں پھر کر شاپنگ کرتی ہے، اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ قانون اسلامی کے خلاف یہ تمام افعال کرنے پر شرمندہ اور نادم ہونے کے بجائے فخر کے ساتھ اپنے ان کارناموں کو بیان کرتی ہے، اور الٹا اس بے چاری عفیفہ کو قابل ملامت ٹھیراتی ہے جس نے قانون اسلام کی پیروی میں حجاب شرعی کو چھوڑنے سے انکار کیا، جسے مردوں کے درمیان بے حجابانہ تماشا بننے کرتے ہوئے شرم آئی، جس کو بازاروں کے چکر لگانا، ناچ اور رگرین کے مزے چکھنا، سیرگاہوں کی ہوائیں کھانا، اُس چار دیواری کی بے لطفیوں کے مقابلہ میں پسند نہ آیا جس کی حدود میں رہنے کا اس کے خدا اور اس کے رسول نے اسے حکم دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے خلاف بغاوت کی اسپرٹ مردوں سے گذر کر عورتوں تک بھی پہنچتی جا رہی ہے، اور وہ بھی اسلام کے قوانین کی خلاف ورزی کو نہیں بلکہ اس کی پیروی کو اس قابل سمجھنے لگی ہیں کہ ایک مسلمان عورت

اس پر شرمندہ و نادم ہو! اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ خدارا بتاؤ کہ پرانی دیندار خاتونوں کی گودوں میں پرورش پانے کے باوجود جب تمہارا یہ حال ہوا ہے تو جب تمہاری عورتیں بھی غیرت ایمانی سے بیگانہ اور اطاعت خدا و رسول کی حدود سے باہر ہو جائینگی تو ان نسلوں کا کیا حشر ہوگا جو ان نئی فرنگیت مآب خواتین کی گودوں میں پرورش پا کر نکلیںگی؟ جو بچے آنکھ کھولتے ہی اپنے گرد و پیش فرنگیت ہی فرنگیت کے آثار دیکھینگے؟ جن کی معصوم نگاہیں اسلامی تہذیب و تمدن کی کسی علامت سے آشنا نہ ہوں گی، جن کے کانوں میں کبھی خدا اور رسول کی باتیں نہ پڑیں گی، جن کے دل و دماغ کی لوح سادہ پر ابتدا ہی سے فرنگیت کے نقوش ثبت ہو جائیں گے کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے جذبات، خیالات، اخلاق، اعمال غرض کسی حیثیت سے بھی مسلمان ہوں گے؟

جرم کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ انسان جرم کرے مگر اُس کو جرم سمجھے اور اس پر شرمندہ ہو۔ اس قسم کا جرم محض اپنی حیثیت کے لحاظ سے سزا کا مستوجب ہوتا ہے، بلکہ توبہ اور اظہار ندامت سے معاف بھی کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ایسا جرم صرف انسان کی فطری کمزوری پر محمول کیا جائیگا۔

جرم کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان جرم کرے اور اس کو جرم نہ سمجھے، نہ اس پر شرمندہ ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ شخص اس قانون کو تسلیم نہیں کرتا جس نے اس فعل کو جرم قرار دیا ہے۔

جرم کا تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان جرم کرے اور اس کو عیب کے بجائے خوبی سمجھے، اور فخر کے ساتھ اس کا علانیہ اظہار کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس شخص کے دل میں اُس قانون کا کوئی احترام ہی نہیں ہے جو اس فعل کو جرم قرار دیتا ہے۔

جرم کا آخری مرتبہ یہ ہے کہ انسان نہ صرف ایک قانون کے خلاف جرم کا ارتکاب کرے، بلکہ ایک دوسرے مخالف قانون کے لحاظ سے اُس جرم کو جائز اور عین صواب سمجھے، اور جو قانون اس فعل کو جرم ٹھیراتا ہے اس کا مذاق اڑائے، اور اس کی پیروی کرنے والوں کو خطاکار سمجھے۔ ایسا شخص صرف قانون کی خلاف ورزی

ہی نہیں کرتا، بلکہ اس کی تحقیر کرتا ہے اور اس کے خلاف بغاوت کا مرتکب ہوتا ہے۔

ہر شخص جس میں تھوڑی سی عقل سلیم بھی ہوگی یہ تسلیم کرےگا کہ جب انسان اس آخری مرتبہ پر پہنچ جائے تو وہ اس قانون کی حدود میں نہیں رہ سکتا جس کے خلاف اس نے علانیہ بغاوت کی ہے۔ مگر کس قدر مردود ہے وہ شیطان جو تم کو یقین دلاتا ہے کہ تم اسلامی قانون کی تحقیر کرکے اُس کا مذاق اڑاکر، اور اس کی پیروی کو عیب ٹھیراکر، اور اس کی خلاف ورزی کو صواب قرار دیکر بھی مسلمان رہ سکتے ہو۔ ایک طرف تو تمہارا یہ حال کہ خدا اور رسول جس کو اچھا کہیں اس کو تم برا کہو، وہ جس کو برا کہیں اس کو تم اچھا کہو، وہ جس کو گناہ ٹھیرائیں اس کو تم صواب قرار دو، وہ جس کو صواب ٹھیرائیں اس کو تم گناہ سمجھو، وہ جو حکم دیں اس کا تم مذاق اڑاؤ، وہ جو قانون بنائیں اس کی خلاف ورزی پر شرمانے کے بجائے تم الٹا اس شخص کو شرمانے کی کوشش کرو جو ان کے قانون کی پیروی کرتا ہے، اور دوسری طرف تمہارا یہ دعویٰ کہ تم خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہو اور ان کی عظمت تمہارے دل میں ہے، اور ان کے پسندیدہ دین یعنی اسلام کے تم پیرو ہو۔ کیا کوئی صاحب عقل انسان تسلیم کرسکتا ہے کہ اس طرزعمل کیساتھ یہ دعویٰ صحیح ہے؟ اگر ایمان کیساتھ انکار جمع ہوسکتا ہے اگر تعظیم کیساتھ تحقیر جمع ہوسکتی ہے، اگر یہ ممکن ہے کسی کا احترام بھی دل میں ہو اور اس کا مذاق بھی اڑایا جائے، اگر یہ معقول ہے کہ خلاف ورزی پر فخر کرنے والا، اور پیروی کو ملامت کے قابل سمجھنے والا بھی پیرو اور مطیع ہو، تو پھر یہ ماننا پڑیگا کہ بغاوت ہی عین اطاعت ہے، اور تحقیر ہی عین تعظیم ہے، اور انکار ہی کا نام ایمان ہے، جو تمھیں ٹھوکر مارتا ہے وہی دراصل تمہاری تعظیم کرتا ہے، جو تمہارا مذاق اڑاتا ہے وہی دراصل تمہارا احترام کرتا ہے، اور جو تمہیں جھوٹا کہتا ہے وہی دراصل تمہاری تصدیق کرنے والا ہے!

اسلام بجز اطاعت کے اور کسی چیز کا نام نہیں ہے، اور حقیقی اطاعت ایمان کے بغیر متحقق نہیں ہوتی، اور ایمان کا اولین اقتضاء یہ ہے کہ جب خدا اور رسول کا حکم کسی کو پہنچے تو اس کی گردن جھک جائے، اور وہ اس کے

مقابلے میں سر نہ اٹھا سکے:۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوْا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲۴:۷)

مومنوں کا قول تو یہ ہونا چاہیے کہ جب ان کو بلایا جائے اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

پھر یہ گردن جھکانا بھی کراہت نہیں بطوع و رغبت ہونا چاہیے حتیٰ کہ حکم خدا اور رسول کے خلاف دل میں بھی کوئی تنگی اور ناراضی چھپی ہوئی نہ ہو۔ جس شخص کی گردن محض ظاہر میں جھک جائے مگر دل میں اس کے خلاف تنگی محسوس کر رہا ہو وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہے:۔

وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلٰى مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُوْلِ رَأَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ...... فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (۴:۹)۔

اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے اتارا ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تم دیکھتے ہو کہ منافقین تمہاری طرف آتے ہوئے جی چراتے ہیں پس قسم ہے تیرے پروردگار کی کہ وہ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے اختلافات میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کر لیں، پھر جو کچھ تو فیصلہ کرے اس پر اپنے دلوں میں تنگی بھی نہ پائیں بلکہ سر تسلیم خم کر دیں۔

لیکن جو شخص علانیہ حکم ماننے سے انکار کر دے، اور خدا اور رسول کے قانون کو چھوڑ کر دوسرے قوانین کی پیروی کرے، اور انہی قوانین کو درست اور حق سمجھے اور ان کی پیروی کرتے ہوئے خدا اور رسول کے قانون کا مذاق اڑائے اور اس کی اطاعت کو عیب ٹھیرائے، وہ تو کسی طرح بھی مومن نہیں ہو سکتا خواہ وہ زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو اور مسلمانوں کے سے نام سے موسوم ہو اور مردم شماری میں اس کو مسلمان لکھا گیا ہو۔ انسان گناہ کر کے مومن رہ سکتا ہے بشرطیکہ گناہ کو گناہ سمجھے اور اس پر نادم ہو اور اس قانون کو تسلیم کرے

جس کے خلاف محض اپنی فطری کمزوری سے اس نے ایک فعل کا ارتکاب کیا ہے لیکن جب گناہ کے ساتھ بے شرمی اور ڈھٹائی بھی ہو اور اس پر فخر بھی کیا جائے، اور اس کو صواب ٹھیرا کر اس شخص کو ملامت بھی کی جائے جو اس کا ارتکاب نہیں کرتا، تو خدا کی قسم ایسے گناہ کے ساتھ ایمان کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس مرتبے میں داخل ہونے سے پہلے ہی آدمی کو قطعی فیصلہ کر لینا چاہیے کہ آیا وہ مسلمان رہنا چاہتا ہے یا اسلام سے نکل کر اس قانون کی اطاعت میں داخل ہو جانا پسند کرتا ہے جس کی پیروی میں اس کو شرح صدر حاصل ہو رہا ہے۔

خدا کے فضل سے ابھی تک مسلمانوں کے عوام اس فرنگیت اور ملحدانہ بغاوت کی رو سے محفوظ ہیں۔ ابھی تک ان کے دلوں میں خدا اور رسول کے احکام کا احترام باقی ہے اور قوانین اسلامی کی پابندی تھوڑی بہت انہی میں نظر آتی ہے لیکن خواص کی روش جس طرح پہلے ان کے اخلاق اور معاملات پر اثر انداز ہو چکی ہے، اسی طرح اندیشہ ہے کہ یہ نئی روش کہیں ان کے ایمان پر بھی رفتہ رفتہ اپنا مہلک اثر نہ ڈال دے۔ عامۂ مسلمین میں جس رفتار کے ساتھ ترک صوم و صلوٰۃ، منکرات و منہیات کا ارتکاب، فرنگی اطوار کی تقلید کا شوق اور فرنگی تہذیب کو خوشنما بنا کر دکھلانے والے کھیل تماشوں کی طرف میلان بڑھ رہا ہے۔ وہ دراصل اس آنے والے خطرے کا الارم ہے اگر ہمارے مترفین کے خیالات کی اصلاح نہ ہوئی اور اسلام کی صراط مستقیم سے ان کا انحراف اسی طرح جاری رہا تو وہ دن دور نہیں جب ساری قوم اس ضلالت میں مبتلا ہو جائے گی اور اللہ کی یہ سنت پوری ہو کر رہے گی کہ اِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۔

مقالات

کتب سماوی پر ایک نظر

توریت و انجیل پر اسلامی رائے

۱۲

از جناب ف وقی شاہ صاحب

ابتک توریت وانجیل کے متعلق ان مضامین میں جو کچھ لکھا گیا وہ بیشتر یا تو علمائے اہل کتاب کے اقوال تھے یا وہ نتائج جو اُن اقوال سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ ناقص اور یہ تبصرہ ناتمام رہے گا اگر علمائے اسلام کی تحقیقات کے نتائج سے بھی یہاں بحث نہ کی جائے کیونکہ مسلمانوں کو بھی توریت وانجیل سے بہت قوی تعلق ہے اور اُن کا اسلام پر ایمان لانا توریت، زبور، انجیل وغیرہم پر بھی ایمان لانے کو مستلزم ہے۔ قرآن میں کم از کم ایک سو اکتیس (۱۳۱) جگہ ان کتب سماوی کا ذکر آیا ہے کہیں فرداً فرداً اور کہیں مجموعاً۔ جن مقامات پر یہود ونصاریٰ یا انبیائے سلف کا ذکر بغیر تذکرہ کتب مقدسہ آیا ہے اُن کا شمار اس کے علاوہ ہے مثلاً۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (۵ : ۳)

اور یہود ونصاریٰ دعوی کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔

یہاں توریت وانجیل کا ذکر نہیں صرف یہود ونصاریٰ ہی کا ذکر ہے۔

شہادت قرآنی کی مثالیں جن آیات میں کتب سماوی کا ذکر مجموعاً آیا ہے اُن کی ایک مثال یہ ہے :۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے اُن کی جان ومال کو خرید لیا ہے کہ اُن کے لیے جنت ہے وہ لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ (۹ : ۱۴)

جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے توریت میں اور انجیل میں اور قرآن میں۔

یہاں توریت و انجیل و قرآن کا ایک ساتھ ذکر آیا ہے۔

جن آیات میں ان کتابوں کا فرداً فرداً ذکر آیا ہے اُن کی دو مثالیں یہ ہیں۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (۲۱)

اور تحقیق ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں بعد نصیحت کے کہ میرے صالح بندے زمین کے وارث بنیں گے"۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا (۶۲ : ۱)

"جن لوگوں کو توریت پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا پھر انہوں نے اُس پر عمل نہ کیا ان کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لادا جاتا ہے"۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اِن کتابوں پر ایمان لانے کا بھی حکم دیا ہے اور ان کتابوں کے منکروں کو گمراہ بتایا ہے اور ان پر عتاب نازل کیا ہے:۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا۔ (۴ : ۲۰)

"اے ایمان والو! (یعنی اے مسلمانو) یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے نازل فرمائی اپنے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اللہ نے نازل فرمائی قبل اس کے اور جو کوئی یقین نہ رکھے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اُس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر وہ شخص یقیناً گمراہی میں بہت دور جا پڑا۔

اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَاۤ اَرْسَلْنَا

"جنہوں نے جھٹلایا اُس کتاب کو اور اس چیز کو جسے

بِرُسُلَنَا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ إِذِ الْأَغْلَالُ فِيْ أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُوْنَ ۝ فِي الْحَمِيْمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ۝ (۴۰: ۸)

ہم نے اپنے پیمبروں کے ساتھ بھیجا انھیں البتہ معلوم ہوجائیگا (یعنی حقیقت حال اُن پر کھل جائیگی) جبکہ طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں انہیں گھسیٹتی ہوئی کھولتے پانی میں ڈال دیں گی پھر وہ آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔"

یہ ہیبت ناک سزائیں صرف انہیں کے لیے نہیں ہیں جو قرآن کے منکر ہیں بلکہ ان کے لیئے بھی ہیں جو انبیا علیہم السلام کے لائے ہوئے صحیفوں کے منکر ہیں۔

مگر یہ ساری تاکید اُس چیز پر ایمان لانے سے متعلق ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام پر نازل فرمائی اور جس پر صحیح طورت وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ اور وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا کا اطلاق ہوتا ہو نہ کہ اُن تحریروں کے متعلق جن کی بابت اللہ تعالیٰ نے خود خبر دی ہے کہ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ جہاں قرآن میں اللہ تعالیٰ نے صحف سماوی پر ایمان لانا مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیا ہے وہاں اس بات کو بھی واضح فرما دیا ہے کہ توریت و انجیل میں اہل کتاب نے تحریفیں کی ہیں۔

تحریف کے متعلق شہادت قرآنی توریت و انجیل میں تحریف اور تبدیلیوں کے واقع ہونے کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے صاف صاف قرآن مجید میں دے دی فرماتا ہے:-

أَفَتَطْمَعُوْنَ أَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۲: ۹)

"مسلمانو! کیا تمہیں یہ امید ہے کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) تمہاری تصدیق کریں گے حالاں کہ ان میں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کا کلام سنتے تھے پھر جان بوجھ کر اس کو بدل ڈالتے تھے۔"

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ
ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
لِيَشْتَرُوا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيلًا (۲ : ۹)
(Ch. 2. V. 79)

"پس خرابی ہے اُن کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب (آیات و الفاظ کتاب) لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں تاکہ اس کے بدلے تھوڑا سا دنیوی فائدہ کرلیں"

مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ
وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۔ (۴ : ۷)

"یہودیوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے بول (یعنی آیات و کلمات) کو اپنے ٹھکانے سے بدل دیتے ہیں اور (منہ سے) کہتے ہیں ہمنے سنا اور (دل سے) کہتے ہیں ہمنے نہیں مانا"

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ
جَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُونَ
الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوا حَظًّا
مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى
خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ (۵ : ۳)

"یہودیوں کی عہد شکنی کے سبب ہمنے اُن کو پھٹکارا اور ان کے دلوں کو سخت کردیا ہے وہ خدا کے بول (آیتیں) ٹھکانے سے بدلتے ہیں اور نصیحت سے فائدہ اٹھانا بھول گئے ہیں تو ہمیشہ ان کی خیانت (یعنی کتاب میں رد و بدل کرتے رہنا) دیکھتا رہیگا بجز ان میں سے تھوڑے لوگوں کے"

وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا ۛ سَمّٰعُونَ لِلْكَذِبِ
سَمّٰعُونَ لِقَوْمٍ اٰخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ ۖ
يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ (۵ : ۶)

"یہودیوں میں بعض جاسوسی کرتے ہیں جھوٹ بولنے کیلئے وہ جاسوس ہیں دوسری جماعت کی طرف سے جو تجھ تک نہیں آئی وہ کلام کو بدل ڈالتے ہیں اُس کے اصلی ٹھکانے سے"

پس جب قرآن میں اس قدر وضاحت کیساتھ توریت و انجیل میں تحریف کا واقع ہونا بیان کیا گیا ہے تو کسی مسلمان کے لئے کیسے ممکن ہے کہ اس تحریف کے وقوع سے انکار کرے لہذا نفس تحریف پر مسلمانوں کا اتفاق ہے اس امر پر البتہ مسلمانوں میں بحث رہی ہے کہ کتب مذکورہ میں تحریف لفظی واقع ہوئی ہے یا تحریف معنوی یا دونوں۔ بکثرت علماء اسلام کی تحقیقات یہ ہے کہ توریت اور انجیل میں دونوں قسم کی تحریفیں ہوئی ہیں الفاظ

بھی بدل دیئے گئے ہیں اور باطل تاویلوں سے معانی بھی بگاڑ دیے گئے ہیں۔ لیکن امام بخاری صرف تحریف معنوی کے قائل ہیں۔ وہ صحیح بخاری کے آخری حصہ میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک اور لفظ ("رقیب") کی تفسیر نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ "یحرفون" کے معنی "یزیلون" کے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب اپنی کتابوں سے کچھ نکال ڈالتے یا اُس میں کچھ ملا دیتے۔ اس کے بعد امام بخاری لکھتے ہیں:۔

ولیس احد یزیل لفظ کتاب من کتب اللہ ولکنھم یحرفونه یتاولونه علیٰ غیر تاویله (بخاری صفحہ ۱۱۲۷)	کتاب اللہ کے الفاظ کو کوئی شخص کتاب سے نکال نہیں سکتا ان کے ازالہ سے یہی مراد ہے کہ وہ لوگ اس میں ایسی تاویل کرتے ہیں جو درحقیقت صحیح تاویل نہیں ہوتی

یہ قول درحقیقت امام بخاری کا ہے۔ مگر بعض حضرات کو اشتباہ و مغالطہ ہوا کہ یہ قول حضرت ابن عباس کا ہے حالانکہ آپکا قول "یحرفون بمعنی یزیلون" پر ختم ہو گیا اور اس کے بعد کا یہ قول جو اوپر نقل کیا گیا ہے امام بخاری کا اپنا قول ہے۔

"یحرفون بمعنی یزیلون" سے ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابن عباس تحریف لفظی کے قائل نہ تھے کیونکہ آپکے قول کی ٹھیک اور صحیح تفسیر یہ ہو سکتی ہے کہ اہل کتاب الفاظ توریت و انجیل کو توریت و انجیل سے نکال دیتے تھے اور اُن کی جگہ دوسرے الفاظ اپنی طرف سے داخل کر دیتے تھے۔ اس کی تائید حضرت ابن عباس کا وہ قول بھی کرتا ہے جو اسی صحیح بخاری کی کتاب التوحید اور کتاب الاعتصام اور کتاب الشہادت میں امام بخاری ہی نے نقل کیا ہے

ان ابن عباس قال یا معشر المسلمین کیف تسئلون اہل الکتب عن شیٔ وکتابکم الذی انزل علی نبیکم احدث الاخبار باللہ محضا لم یشب وقد حدثکم اللہ ان اہل الکتب	ابن عباس نے کہا اے مسلمانو! تم اہل کتاب سے کیوں کر باتیں پوچھتے ہو حالانکہ تمہاری کتاب جو تمہارے نبی پر نازل ہوئی ہے خدا کی طرف سے بعد میں آئی (یعنی جدید ترین ہے)، وہ خالص ہے اس میں کوئی آمیزش نہیں ہوئی۔ اہل کتاب کی نسبت خدا نے تمکو یہ خبر دی

بدلوا كتاب الله وغيروه وكتبوا
بايديهم الكتاب وقالوا هو من
عند الله ليشتروا به ثمنا قليلا اولا
ينهاكم ما جاءكم من العلم عن مسألتكم
لا والله ما راينا منهم رجلا يسألكم
عن الذی انزل عليكم (بخاری ص ۳۶۹ ج ۲ / ۱۰۹۲، ۱۱۱۲)

ہے کہ انہوں نے اپنی کتابوں کو بدل دیا ہے۔ اپنے ہاتھوں
سے کچھ لکھا اور کہدیا کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ
اس کے بدلے تھوڑا سا مول لے لیں کیا جو تمکو خدا نے
علم دیا ہے وہ تمکو اہل کتاب سے استفسار میں مانع نہیں ہوتا؟
بخدا ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو تمہارے دین کی بات
تم سے پوچھتا ہو (یعنی پھر تم اُن کے دین کی باتیں اُن سے
کیوں پوچھتے ہو؟)

یہ قول فصل ہے اس بارہ میں کہ حضرت ابن عباس تحریف لفظی اور تحریف معنوی دونوں کے قائل ہیں امام بخاری ہی صرف تنہا وہ بزرگ ہیں جو توریت وانجیل میں تحریف لفظی کے قائل نہیں لیکن انکا قول اس باب میں حجت وسند نہیں۔ حدیث کی تصحیح وتضعیف اور رجال کی جرح وتعدیل میں البتہ انکا قول مستند مانا جاتا ہے لیکن فنون حدیثیہ کے علاوہ دیگر فنون ومسائل میں تنہا اُن کا کوئی قول جمہور علماء کے اقوال کے مقابلہ میں مستند نہیں سمجھا جاسکتا بالخصوص اُس حالت میں جبکہ وہ قول محض ظن اور قیاس پر مبنی ہو اور اس کی تائید میں وہ کوئی سند یا دلیل نہ رکھتے ہوں۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں سلف میں بہت لوگ ایسے گذرے ہیں جو ایک فن کے امام تھے مگر دوسرے فنون سے ناآشنا تھے۔ ذہبی نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ:۔

بہت لوگ ایسے گذرے ہیں جو ایک فن میں ماہر اور دوسرے فنون میں قاصر تھے مثلاً سیبویہ علم نحو میں امام تھے مگر یہ نہ جانتے تھے کہ حدیث کیا شے ہے وکیع حدیث میں امام تھے مگر عربیت (یعنی علم ادب) نہ جانتے تھے۔ ابو نواس شاعری کا رئیس تھا مگر دیگر فنون سے عاری تھا۔ عبدالرحمن بن مہدی حدیث میں امام تھے اور یہ نہ جانتے تھے کہ طب کیا ہوتی ہے محمد بن حسن

فقہ میں امام تھے اور نہ جانتے تھے کہ فن قرأت کیا شئے ہے۔ امام حفص قرأت کے امام تھے
اور حدیث سے تہی دست سچ ہے کہ میدان کارزار میں مرد میدان خاص ہی لوگ ہوتے ہیں
جو لڑنے میں شہرت رکھتے ہیں''۔

اس طرح امام بخاری اگر توریت وانجیل پر غائر نظر نہ رکھتے ہوں تو یہ نہ کوئی تعجب کا محل ہے نہ فن حدیث میں جو وہ بلند مرتبہ رکھتے ہیں اُس میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے بجز روایت وتحقیق حدیث وتنقید رجال کے کسی اور فن میں اُن کا دخیل ہونا اور مشغول رہنا ثابت نہیں محض ظن کی بنا پر انہوں نے یہ فرما دیا کہ کتاب اللہ کے الفاظ کو کون نکال یا بدل سکتا ہے'' ان کی نظر غالباً اُن الفاظ پر نہیں پڑی جو اُن کتابوں میں موجود ہیں مگر کسی طرح خدا کے کلمات نہیں ہوسکتے۔ اور نہ ان کی نظر اس جانب گئی کہ ظالموں نے خدا کی کتاب کو جلا دیا، خدا کے نبیوں کو تہ تیغ کیا، اور خدا کے نبیوں پر اتہامات لگائے۔ کتاب کی عبارتوں میں رد و بدل کر دینا اور لفظی و معنوی تحریفوں کا عمل میں لانا تو ایسے لوگوں کے لیے ایک ہلکا اور آسان کام تھا۔

علماء اسلام نے نہایت شد و مد کے ساتھ امام بخاری کے اس قول کا مقابلہ کیا ہے اور ان کی ظنی دلیل کا کافی جواب دیا ہے اور واقعات تاریخی سے ثابت کیا ہے کہ ان کتابوں میں لفظی اور معنوی دونوں تحریفیں موجود ہیں۔ ان میں سے نمونہ کے طور پر بعض علماء کے چند اقوال ہم ذیل میں درج کرتے ہیں ان سے موجودہ توریت وانجیل کے متعلق عام اسلامی رائے کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

اقوال علماء قسطلانی نے شرح صحیح بخاری میں امام بخاری کے اس قول کے مقابلہ میں فرمایا ہے کہ:۔

''بہت سے علماء اسلام نے تصریح کیا ہے کہ یہود و نصاریٰ نے بہت سے الفاظ توریت و انجیل کو بدل دیا ہے بعض کا قول ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو بالکل ہی بدل ڈالا ہے اور اس خیال سے وہ ان کتابوں کی بے ادبی کرنے کو جائز سمجھتے ہیں مگر یہ قول محل اعتراض ہے۔ بہت سی آیات واحادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کتابوں کی بہت سی چیزیں اپنی اصل پر ہیں جیسے رجم

وغیرہ بعض کا قول ہے کہ تھوڑے الفاظ میں تبدیلی ہوئی ہے بعض کا قول ہے کہ صرف معانی میں تبدیلی ہوئی ہے نہ کہ الفاظ میں چنانچہ بخاری نے یہی لکھا ہے مگر یہ قول بھی محل اعتراض ہے۔ ان کتابوں میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو خدا کی طرف سے ہرگز نہیں ہو سکتے بعض علماء نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ ان کتابوں کا شغل رکھنا اور ان کو لکھنا دیکھنا جائز نہیں ہے۔ . . . مگر اس باب میں بہتر قول یہ ہو کہ جو شخص صاحب تمیز و بصیرت نہ ہو اس کو ان کتابوں کا شغل جائز نہیں اور جو صاحب تمیز ہو اور علم و دین میں مضبوط ہو اس کے لیے جائز ہے خصوصاً اس حالت میں جبکہ بعض مخالفین اسلام کو ان کتابوں کی مدد سے جواب دینا پڑے اس پر دلیل یہ ہے کہ علمائے قدیم سے اب تک علماء توریت سے ایسی باتیں نکالتے آئے ہیں جن سے منکرین نبوت محمدیہ کو الزام دیتے چلے آرہے ہیں۔"

حافظ ابن حجر نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں امام بخاری کے قولِ مذکور کے تحت میں لکھا ہے کہ:

"ہمارے شیخ ابن الملقن نے فرمایا کہ یہ جو بخاری نے تفسیر آیۂ "یحرفون" کے بارے میں کہا ہے یہ ایک قول ہے جس کو امام بخاری نے پسند کیا ہے مگر ہمارے اکثر علماء نے بتصریح کہا ہے کہ یہود و نصاریٰ نے الفاظ توریت و انجیل کو بدل ڈالا ہے اور اس پر انہوں نے یہ مسئلہ متفرع کیا ہے کہ ان کتابوں کی بے ادبی کرنی جائز ہے لیکن یہ بات قول بخاری کے مخالف ہے۔"

پھر آگے چل کر ابن حجر تحریر فرماتے ہیں۔

"بعض متاخر شارحین بخاری نے کہا ہے کہ اس مسئلہ تحریف میں کئی اقوال ہیں۔ ایک یہ ہے کہ توریت و انجیل سب کی سب بدل گئی ہیں۔ ان کتابوں کی بے ادبی کا جواز اسی قول کا مقتضیٰ ہے مگر یہ زیادتی ہے، اور اس قول کی یہ تاویل ضروری ہے کہ تحریفِ کل سے اکثر حصہ کی تحریف مراد ہے، ورنہ یہ بے فائدہ کا جھگڑا ہوگا۔ کیونکہ بہت سی آیات و احادیث سے ثابت ہے کہ ان کتابوں میں بہت سی چیزیں اپنی اصل پر ہیں جن میں تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ایک آیت میں

ارشاد ہے اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ یعنی وہ جو رسول کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے پاس توریت میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وازانجملہ قصہ رجم ہے جسمیں مذکور ہے کہ توریت میں حکم رجم موجود ہے۔ اس امر کا مؤید خدا کا یہ قول ہے فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ یعنے توریت لاؤ اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تحریف ان کتابوں کے اکثر حصہ میں ہوی ہے۔ اس قول کے دلائل یعنی شواہد وامثال اکثرت موجود ہیں۔ اور پہلے قول کو اسی قول کے معنی میں لینا واجب ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اکثر حصہ ان کتابوں کا محفوظ ہے تھوڑے حصہ میں تبدیلی ہوی ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ تبدیلی صرف معنی میں ہوی ہے۔ الفاظ سب محفوظ ہیں صحیح بخاری کے اس مقام میں یہی قول بیان ہوا ہے۔ ابن تیمیہ سے اس مسئلہ کی بابت سوال ہوا تو انہوں نے اس کے جواب میں ایک فتویٰ لکھا جس میں کہا کہ اس باب میں علماء کے دو قول ہیں۔ ایک یہہ کہ الفاظ میں بھی تبدیلی ہوی ہے۔ دوسرا یہ کہ صرف معانی میں ہوی ہے"۔

اس کے بعد ابن حجر نے ابن تیمیہ کی طرف سے اُن دلائل کا رد نقل کیا ہے جو مجوزان تحریف معانی پیش کیا کرتے ہیں۔ پھر علامہ ابن حزم کی کتاب الملل والنحل کی وہ عبارت نقل کی ہے جس میں انہوں نے توریت کی اُن باتوں کی جانب اشارہ کیا ہے جو حق تعالیٰ کا کلام نہیں ہوسکتیں۔ مثلاً یہ کہ (نعوذ باللہ) لوط علیہ السلام کی بیٹیوں نے اپنے باپ لوط کو شراب پلائی پھر اُنسے بدفعلی کرا کے حاملہ ہوئیں۔ اس کے بعد ابن حجر علامہ ابن حزم کی مندرجہ ذیل عبارت نقل کرتے ہیں:۔

"بعض مسلمانوں سے ہم کو یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ توریت وانجیل میں لفظی تحریف واقع ہونے سے منکر ہیں۔ حالانکہ قرآن وحدیث میں آچکا ہے کہ "یہود ونصاریٰ خدا کے کلام کو بدل ڈالتے ہیں۔

اور خدا پر دیدہ و دانستہ جھوٹ باندھتے ہیں کہ یہ بات خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتی۔ اور وہ حق بات کو چھپاتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ وہ حق ہے"۔ منکرین تحریف کے جواب میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں اصحاب نبوی کے حق میں فرمایا ہے کہ ان کا حال اور ان کی صفت توریت و انجیل میں یوں موجود ہے کہ "وہ ایک کھیتی کے مانند ہیں جس نے نکالا اپنا پٹھا" (تا آخر سورۃ الفتح) مگر اب توریت و انجیل میں اصحاب کی یہ صفت مذکور نہیں ان منکرین تحریف سے جن کا قول یہ ہے کہ جب توریت بہ نقل متواتر منقول ہے تو اس میں تحریف کیونکر ممکن ہے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اس بات پر متفق ہیں کہ توریت و انجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا ذکر موجود نہیں۔ اب اگر تم اُن کی اس کتاب کی (جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا ذکر نہیں) تصدیق کرو گے تو تم کو اس امر کی بھی تصدیق کرنی پڑے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اصحاب کا ذکر توریت میں نہیں ہے (جس سے تصدیق قرآن فوت ہو نگی) اور اگر اِس امر کی تصدیق کرو گے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ باقی سب کتاب کی تصدیق کرو اور اُس کو تحریف سے محفوظ مان لو کیونکہ وہ سب یکساں ہے"۔

حافظ ابن القیم حنبلی نے بھی کتاب اغاثۃ اللھفان میں اس مسئلہ پر طول طویل بحث کی ہے اور امام بخاری کے قول کے جواب میں ابن تیمیہ کی لمبی چوڑی عبارت اُن کی تالیف "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح" سے نقل کی ہے۔ پھر اہل کتاب نے جو تحریفات لفظی و معنوی کی ہیں انہیں بیان کیا ہے اور اُن کے تحریف سمجھے جانے کے وجوہ بیان کیے ہیں۔ انہوں نے اور دیگر علمائے اسلام نے تحریف لفظی کی دس مثالیں پیش کی ہیں تحریفات کا شمار تو اس سے بہت زیادہ ہے مگر مسلمان علماء نے مثال کے طور پر صرف انہیں تحریفوں پر زور دیا ہے۔ جن کا تحریف ہونا قرآن و حدیث سے ثابت ہے وہ دس مثالیں یہ ہیں:-

(۱) موجودہ توریت میں بجائے اسمٰعیل علیہ السلام کے اسحٰق علیہ السلام کو ذبیح اور ابراہیم علیہ السلام کا پہلوٹھا یا اکلوتا بیٹا قرار دیا ہے۔ اس قول کے غلط ہونے کے ابن القیم نے دس وجوہ بیان کیے ہیں۔

(۲) لوط علیہ السلام پر اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ زنا کی تہمت اور ان دونوں بیٹیوں کا زنا سے حاملہ ہوجانا اور اُن سے حرامی اولاد کا پیدا ہونا۔

(۳) یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یہودا پر اپنی بہو سے زنا کی تہمت، اُس کا حاملہ ہونا اور حرامی بچے جننا اور اس حرامی بچہ کی نسل سے داؤد علیہ السلام کا پیدا ہونا۔

(۴) ہارون علیہ السلام کو گوسالہ پرستی کا بانی قرار دینا۔

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر اور آپ کے متعلق پیشینگوئیوں کو اہل کتاب کا اپنی کتابوں سے نکال دینا۔ علمائے اسلام نے اس پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ بڑی فاضلانہ بحثیں کی ہیں۔

(۶) سورۃ الفتح کے آخر میں اصحاب رسول اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں اور جن کی بابت اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے۔ کہ ذَالِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِيْلِ اُن اوصاف کا اِن کتابوں سے خارج کردینا۔

(۷) عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل میں بذریعہ تحریف لفظی ابن اللہ بنا دینا اور بذریعہ تحریف معنوی اس ابنیت کو حقیقی قرار دینا۔

(۸) انجیل میں ایسے الحاقی الفاظ داخل کردینا جن پر عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔

(۹) عیسیٰ علیہ السلام کی صلیب پر موت اور دوبارہ زندگی۔

(۱۰) عیسیٰ علیہ السلام کی اس موت کو قربانی اور دوسروں کا کفارہ قرار دینا۔

بعض لوگوں کو امام رازی کے متعلق بھی یہ التباس ہوا ہے کہ مثل امام بخاری کے یہ بھی تحریف لفظی

کے قائل نہیں۔ مگر بات صرف اتنی ہے کہ جن آیات قرآنی میں تحریف معنوی کی جانب اشارہ ہے وہاں وہ اپنی تفسیر میں تحریف معنوی کا مراد ہونا بیان کرتے ہیں اور اُس کو اصح کہتے ہیں۔ اور جہاں تحریف لفظی کی جانب اشارہ ہے وہاں تحریف لفظی کا بخوبی اثبات کرتے ہیں اور اس کو بہتر قرار دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے صرف ایک ہی قسم کے قول یعنی کلام مثبت تحریف معنوی کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکال لیا کہ امام صرف تحریف معنوی ہی کے قائل ہیں انہوں نے غلط نتیجہ نکالا۔ سورہ بقرہ کی آیت (جو اوپر درج ہو چکی ہے) کی تفسیر میں امام رازی لکھتے ہیں کہ:

"یہ تحریف لفظاً بھی ہے یا معنی ہیں لیکن لفظی تحریف کی تجویز معنوی تحریف کی تجویز سے بہتر ہے کیونکہ اگر کلام الٰہی اپنی اصلی صورت پر باقی رہے اور صرف اس کے معنی میں تاویل کی جائے تو اس صورت میں وہ لوگ کلام الٰہی کے بدلنے والے نہ کہلاتے بلکہ صرف اس کے معنی کے محرف بنتے (حالانکہ وہ کلام الٰہی کے بدلنے والے ٹھیرائے گئے ہیں)۔ اس تحریف سے یہ معنی (یعنی تحریف لفظی کے) مراد لیے جائیں تو بہتر ہے جیسا کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ "اہل کتاب نے ان کتابوں میں کمی و بیشی کی ہے" یہ معنی نہ ہو سکیں تب تحریف معنوی مراد لینا اچھا ہے"۔ (تفسیر کبیر صفحہ ۵۰۵ جلد اول)

آیت سورۃ النساء کی تفسیر میں امام رازی لکھتے ہیں کہ:-

"خدا تعالیٰ نے یہاں "عن مواضعہ" فرمایا ہے۔ اور سورۃ المائدہ میں "من بعد مواضعہ" فرمایا۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ سورۃ النساء کے الفاظ سے تاویل مراد ہے اور اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ آیات توریت وغیرہ کی باطل تاویلیں کرتے ہیں۔ اس میں یہ بیان نہیں ہے کہ وہ ان الفاظ کو کتاب اللہ سے نکال دیتے ہیں۔ اور جو الفاظ سورۃ المائدہ میں ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں تحریفیں عمل میں لاتے ہیں۔ تاویل باطل بھی کرتے ہیں اور الفاظ بھی بدل ڈالتے ہیں۔ اس آیت میں "یحرفون الکلم" سے تاویل باطل کی طرف اشارہ ہے

اور "من بعد مواضعہ" میں الفاظ کو کتاب میں سے نکال ڈالنے کی طرف اشارہ ہے"۔

تفسیر کبیر صفحہ ۳۳۸ جلد ۳۔

پھر امام رازی اپنی تفسیر میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ جس کتاب کے حروف و کلمات کی شہرت حد تواتر تک پہنچ چکی ہو اس کے حروف و کلمات میں تبدیلی کیوں کر ممکن ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس وقت اس کی تبدیلی ہوئی تھی اس وقت شائد اس قوم میں قلت ہو اور توریت کے جاننے والے علماء اور بھی کم ہوں۔ اس لیے وہ لوگ اس تحریف و تبدیل پر قادر ہوگئے"

(تفسیر کبیر صفحہ ۳۳۸ جلد ۳)

ان کتابوں کی شہرت "حد تواتر" تک پہنچنے کی بابت بھی علمائے اسلام نے بہت کافی حد تک تنقید کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ان کتابوں کا جمیع الفاظ و اجزاء متواترہ ہونا ثابت نہیں۔ اول تو ان کتابوں کے تعین مصنفین اور تعین زمانہ تصنیف میں خود اہل کتاب کے نزدیک اختلاف ہے اور ان کتابوں کے بہت سے الفاظ و فقرات و ابواب کا مصنفین کتب سے بتواتر منقول ہونا اور کمی بیشی سے محفوظ ہونا وہ خود تسلیم نہیں کرتے اور ان کتابوں میں کمی و بیشی و تغییر و تبدل کے وہ صاف صاف معترف ہیں۔ اہل اسلام کے نزدیک نقل متواتر کے لیے شرط ہے کہ اس کی ابتدا اور وسط میں بھی ویسی ہی کثرت ہو جیسی کہ انتہا میں اور کسی درجہ میں ایسی قلت نہ ہو جس سے اس کے ناقلین کا کذب پر اتفاق ممکن ہو۔ حالانکہ ہمارے مضامین سلسلہ ہذا کے گذشتہ نمبر ثابت کر چکے ہیں کہ توریت و انجیل کو یہ تواتر حاصل نہیں ہوا۔ دوم یہ کہ عہد جدید کے متعلق یہ امر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ کتب عہد جدید پر کسی وقت بھی کوئی زوال نہیں آیا اور جن لوگوں کی طرف یہ کتابیں منسوب ہیں (مثلاً متی یوحنا پولوس وغیرہم) انہی سے ان کتابوں کا ہر جزء بہ نقل متواتر ہم تک پہونچا ہے تب بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کتابوں میں جو تعلیم و ہدایات و مضامین درج

وہ عیسی علیہ السلام سے (جن پر انجیل کا نازل ہونا مسلمانوں کے نزدیک مسلم ہے) بتواتر منقول ہوں لہذا اس تواتر مفروض الوجود کا سلسلہ متی وغیرہ ہی پر ختم ہوتا ہے اور ان لوگوں کا صاحب الہام یا خدا کی طرف سے رسول ہونا مسلمان تسلیم نہیں کرتے نہ عیسائی اسے ثابت کر سکتے ہیں مسلمانوں کے نزدیک وہی انجیل واجب التسلیم والایمان ہے جو کہ عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی نہ کہ موجودہ مجموعہ عہد جدید جسے اور لوگوں نے تصنیف کیا۔ اس امر کی بابت ۱۸۵۶ء سے قبل علماء دہلی نے ایک فتویٰ شائع کیا تھا جس پر متعدد علماء کی مہریں ثبت تھیں۔ اُس کی پوری عبارت کے یہاں درج کرنے میں طوالت ہوگی اس لیے اس میں سے دو اقتباسات ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

”نزد اہل اسلام انجیل عبارت از کلام آلہی تبارک و تعالی است کہ بر حضرت عیسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نازل شدہ بود مشتمل بر ہدایت و نور و مصدق احکام توریت و نصیحت برائے پرہیزگاران نہ از ایں مجموعہ عہد جدید“

دوسرا اقتباس یہ ہے:۔

”بودن این تراجم مذکورہ یا اصل آنہا ہم اگر مطابق ہمیں تراجم مسطورہ است ہمان انجیل یعنی کلام ربانی کہ او تعالی لجلشانہٗ بانزال فرمودن آن بر حضرت عیسٰی علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام در قرآن خبر دادہ نزد علماء شریعت محمدیہ علی صاحبہا الف صلوٰۃ وتحیۃ بخبر آحاد ہم مروی و محفوظ نیست چہ جاکہ خبر مشہور باشد و اعمال حوارین کہ تصنیف لوقا تابعی است و ہمچنین نامجات پولوس وغیرہ در مذہب ما داخل نیستند بلکہ انجیل نزد ما فقط عبارت از آن کلام حضرت عیسیٰ بود کہ موافق وحی ربانی ارشاد آن فرمودہ پس اطلاق کلام ربانی براین مجموعہ بلا سند شرعی چگونہ کردہ شود۔ بلکہ اطلاق کلام ربانی بر اصل توریت کہ بزبان عبرانی بودہ بر مجموعہ اصل انجیل بسبب تحریفات کثیرہ ہم نمتواند شد زیرا کہ تحریفات بیشتر در

اصل ہر دو کتاب توریت و انجیل از ایشان واقع شد و قرآن شریف بر تحریفات اینہا ناطق است۔"

مسلمان علماء کے نزدیک موجودہ توریت و انجیل کا مرتبہ بلحاظ صحت و ثبوت احادیث صحیحہ متواترہ سے گھٹا ہوا ہے بلکہ خبر واحد کے بھی برابر نہیں۔ صحیح اور متواتر احادیث نبوی وہ سمجھی جاتی ہیں جن کی ہر زمانہ میں بکثرت روایت کی گئی ہو اور عقل اُن کے کذب کو محال جانے اخبار آحاد کا اطلاق ان احادیث پر ہوتا ہے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صرف ایک یا دو یا چار اصحاب نے نقل کیا ہو گو بعد میں اُنکی نقل میں تواتر ہوگیا ہو۔ عیسائی محققین کی عینک سے بھی دیکھا جائے تو یہ کتابیں آحاد کے مرتبہ تک نہیں پہنچتیں کیونکہ ان کے ابتدائی راویوں ہی کے وجود میں اختلاف و شکوک واقع ہو چکے ہیں۔

باقی

اہل کتاب اور ایمان بالرسالت

(از جناب پرویز بی۔ اے ہوم ڈیپارٹمنٹ نئی دہلی)

آزادی فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے لیکن جس طرح فطرت کے ہر عطیہ سے صحیح صحیح فائدہ حاصل کرنے کے لیے تعین حدود و شرائط ضروری ہے اسی طرح آزادی بھی صحیح معنوں میں اسی صورت میں نفع بخش ہو سکتی ہے جب اسے بھی حدود و قیود سے محصور کیا جائے۔ یہی تعیین حدود، مذہب کا منصب ہے۔ سلیم الفطرت طبائع تو اس تحدید کو آیۂ رحمت سمجھتی ہیں کہ وہ انہیں ہلاکت و بربادی کے عمیق غاروں سے بچاتی ہے لیکن سرکش طبائع کی یہ حالت ہے کہ وہ ہمیشہ اس حدود شکنی اور قیود فراموشی میں ہی لطف زندگی محسوس کرتی ہیں اور انکی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان کی طبعی جولانیوں اور نفسانی کام جوئیوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے۔ حتیٰ کہ تعینات کے تمام پردے اٹھ جائیں اور حدود و شرائع کے امتیازی خطوط یوں مٹتے چلے جائیں کہ جائز و ناجائز کی تمیز ان کی اپنی عقل کے تابع ہو جائے۔ اور کفر و ایمان، حلال و حرام کی کچھ بحث ہی باقی نہ رہے اسلام کی یہ ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ اس نے اس حدود بندی میں کہیں ایسی سخت گیری سے کام نہیں لیا جو انسان کے لیے غیر فطری کہلائی جاسکے لیکن اس کی پابندی بھی تو سلیم الفطرت طبائع ہی کے لیے خوش آیند ہوتی ہے، سرکش طبائع کی تو یہ کیفیت ہے کہ:۔

فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ إِن تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَث۔ (۷ : ۲۲) — اس کی مثال کتے کی سی ہے کہ اگر اس پر تو بوجھ رکھے بھی ہانپے۔ اور اگر چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔

ان میں سے بعض لوگ تو مذہب کے خلاف علانیہ علم بغاوت بلند کر کے مکمل آزادی حاصل کر لیتے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اسلام کی طرح ان کے کفر کی وفاداری مشروط بہ استواری نہیں ہوتی۔

وہ خواہشات نفسانی کی کامرانیوں میں "دل کی حکومت" پر کسی اور قوت کا (Control) بھی گوارا نہیں کرنا چاہتے اور ساتھ ہی ساتھ، بعض مصالح کے بنا پر مذہب سے اپنا رشتہ بھی منقطع نہیں کرسکتے۔ ایک طرف وہ یہ بھی اعلان کرتے رہتے ہیں کہ اسلام دنیا کا مکمل ترین مذہب ہے اور نوع انسانی کی فلاح وبہبود اسی کے ساتھ وابستہ ہے اور دوسری طرف اپنی بارگاہ جبروت سے یہ فتویٰ بھی شائع کرتے رہتے ہیں کہ حصول مقاصد کے لیے عقیدہ کوئی شئے نہیں "ایک مشرک کو محض اس لیے جہنم میں کیوں ڈال دیا جائے کہ اس نے خدا کے سوا کسی اور کے سامنے بھی اپنا سر جھکا دیا تھا" کوئی معاملہ، اعمال سے متعلق ہو یا عقائد سے، جب ان کے سامنے آتا ہے تو وہ کبھی یہ نہ دیکھیں گے کہ خدا اور رسول کا اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ بلکہ وہ ہمیشہ اسے اس خیال کے تابع دیکھیں گے کہ اسے یوں ہونا چاہیے، یہ گروہ تو بحیثیت مسلمان قابل تخاطب ہی نہیں۔ اس لیے کہ جو شخص شرک اور توحید کے عقیدہ میں کوئی فرق نہیں سمجھتا، جو کسی معاملہ کے فیصلہ میں اپنی عقل کو ہی حکم تسلیم کرتا ہے اس کے سامنے قرآنی استدلال پیش کرنا خود اپنی حماقت کا ثبوت دینا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں آئین وضوابط، عبادات ومناسک، شرائع ومناہج کے صرف اصول مذکور ہیں۔ اُن کی تفصیل وتبیین تشکیل وتعمیل، ہیں اس "صراط مستقیم" میں ملیگی جس کی نسبت خود خدائے تعالی نے فرمایا کہ وہ تمہارے لیے ایک بہترین نمونہ ہے (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ) لہذا ایک گروہ نے تکلیفات شرعیہ سے بچنے کے لیے یہ راہ نکالی کہ اوامر ونواہی میں قرآنی اجمال ہی واجب الاتباع ہے، شریعت میں اسوۂ رسول اللہ کی کوئی حیثیت نہیں۔ لیجیے ایک "ذراسی" تبدیلی سے ہزاروں پابندیاں اٹھ گئیں۔ ان میں سے بعض کا تو یہ خیال ہے کہ قرآن کریم میں عبادات وغیرہ کے لیے جو اجمالی احکام ہیں ان کی تفصیل بھی خود قرآن ہی کے اندر موجود ہے۔ اور اس تفصیل کی تلاش میں پھر وہ بڑی بڑی نادر تاویلات کھینچ تان کراتے ہیں کہ اللہ کی پناہ! لیکن بعض حضرات ان سے بھی چار قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ نہیں قرآن کریم میں الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ وغیرہ کے الفاظ معروف بہ لام عہدی ہیں جس سے مطلب یہ

کہ جس قسم کی صلوٰۃ یا زکوٰۃ مسلمانوں کے لیے فرض قرار دی گئی ہے، مخاطبین کے سامنے اس وقت اس کی عملی صورتیں موجود تھیں یعنی امم سابقہ کے پیرو آن کو اسی صورت اُسی ہیئت سے بجالاتے تھے جو مسلمانوں میں رائج ہوگئیں، لہٰذا جس چیز کی تفصیل مخاطبین کے سامنے موجود تھی، اس کی مزید وضاحت کی قرآن میں کیا ضرورت تھی؟ آپ شاید حیران ہوں کہ ایسا دعویٰ کس طرح سے پیش کیا جاسکتا ہے کہ جس کی تکذیب خود قرآن میں موجود ہے (کہ اس وقت کے مخاطبین کی نماز کے بارے میں خود قرآن گواہ ہے کہ وہ کعبہ کے گرد سیٹیاں بجانا اور ننگے ناچ کرنا تھا) اور تاریخ بھی اس کو باطل ٹھیراتی ہے (کہ تمام اہل کتاب کی نمازیں ہمارے سامنے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی تو مسلمانوں کی نماز سے مشابہ نہیں۔ چہ جائے کہ بالکل یکساں ہو۔) لیکن اس کا کیا علاج کہ ایسے حضرات موجود ہیں جن کا دعویٰ یہی ہے۔

یہ گروہ چونکہ ایک مستقل فرقہ بن چکا ہے۔ اور اس کے عقائد کے متعلق بہ حیثیت ایک فرقہ کے ایک عرصہ سے بحث و مباحثہ ہوتا چلا آرہا ہے، اس لیے اس مقالہ میں ہمارا تخاطب ان سے بھی نہیں۔

البتہ ایک تیسرا گروہ ہے جس کا دعویٰ ہے کہ چونکہ ہر قوم میں کوئی رسول ضرور مبعوث ہو چکا ہے نجات و سعادت کے لیے کسی خاص شرع و منہاج کی ضرورت نہیں۔ ایک یہودی یا نصرانی، گبر و برہمن اپنے اپنے عقیدے پر قائم رہتے ہوئے اسی طرح نجات حاصل کرسکتا ہے جس طرح ایک مومن قرآن اور رسول اللہ کے اتباع سے حاصل کرسکتا ہے۔ اگرچہ ان کا یہ دعویٰ تو ایک بڑے وسیع دائرہ کو محیط ہے لیکن اس کی مخصوص شکل یوں سمجھیے کہ ان کے نزدیک اہل کتاب کے لیے یعنی ان اقوام کے لیے جنہیں دعویٰ ہے کہ وہ کسی نہ کسی پیغمبر کی شریعت اور کتاب کے حامل ہیں، قرآن اور رسول اللہ پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ اس مقالہ میں صرف انہی مسلمان حضرات کو مخاطب کیا جارہا ہے جن کا یہ عقیدہ ہے، اور کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کریم کے واضح اور منصوص احکام اس بارے میں ان کے سامنے رکھ دیے جائیں تاکہ وہ خود فیصلہ کرسکیں کہ ان کا یہ عقیدہ کس حد تک قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہے۔ اور کس حد تک اس میں ان کی مزعومہ

اور رواداری کا دخل ہے جس کے متعلق وہ اکثر محسوس نہیں کرتے کہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ جس شخص کا قرآن پاک کی حقانیت پر ایمان ہے، قرآن کریم کا کھلا کھلا فیصلہ سامنے آجانے کے بعد اس کے لیے سرتابی و روگردانی کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ اہمیت اس موضوع کی اس لیے زیادہ ہے کہ چند سال ادھر سے اس عقیدہ کی ایک عام رو پھیلتی چلی جارہی ہے، اور معترضین کے اس دعوے کے ثبوت میں جسقدر دلائل نظر سے گذر رہے ہیں وہ عام طور پر قرآن کریم کی صحیح تعلیم سے بے خبری پر مبنی ہوتے ہیں۔ یوں بھی تمام مذہبی نظام میں ایمان بالرسالت ایک نہایت اہم اور نہایت نازک مقام ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہی وہ مرکز اور وہ قطب ہے جس کی بنا پر یہ نظام قائم ہے۔ لہذا اس کے متعلق ایک صحیح، واضح، غیر مشکوک اور غیر متزلزل ایمان ہمارے قلوب میں مرتسم ہونا چاہیے کہ یہی وہ پل صراط ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے، اور جس کے پاؤں استدلال میں اس پر ذرا بھی لغزش ہوئی، ضلالت و گمراہی کے ابدی جہنم میں گر گیا۔ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ۔

جس شخص نے قرآن کریم کا ایک بار بھی مطالعہ کیا ہے اس پر اس حقیقت کے واضح کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ قرآن کریم نے عمل صالح کو ایمان سے مشروط رکھا ہے۔ و اذا فات الشرط فات المشروط۔ ایمان ہی نہ ہو تو عمل صالح کس طرح ہو سکتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایمان کے بارے میں قرآن کریم کا کیا مطالبہ ہے اور اس کی رو سے ایمان کن اجزاء لاینفک پر مشتمل ہے۔ قرآن پاک کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ اجزاء ایمان قرآن کی رو سے پانچ ہیں۔ اللہ۔ ملائکہ۔ کتب۔ رسل۔ یوم آخر۔ اس کی تصریح کئی مقامات پر مذکور ہے۔ مثلاً

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (۲: ۲۲)	بلکہ نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر، اور یوم آخر پر، اور ملائکہ پر اور کتاب پر اور نبیوں پر۔

انہی اجزائے ایمانیہ کے انکار کا نام کفر اور صریح گمراہی ہے:۔

وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا۔ جو کوئی انکار کرے اللہ سے۔ اور ملائکہ سے۔ اور کتابوں سے اور رسول سے اور قیامت کے دن سے تو وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ (۴ : ۲۰)

لیکن قرآن کریم کا اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ مناسب مقامات پر تو تفصیل دیتا ہے لیکن جب دیگر مختلف مقامات پر اس تفصیل کے حوالہ کی ضرورت ہوتی ہے تو صرف اجمالاً اس کا ذکر کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ اجزائے ایمان کے متعلق بھی یہی انداز و اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ تفصیلاً اجزائے ایمان بیان کر دینے کے بعد اب جہاں جہاں جس جزو پر زور دینے کی ضرورت ہوتی ہے، یا اس تفصیل کا حوالہ مقصود ہوتا ہے، وہاں ایک ایک دو دو اجزا کا ذکر کرتا جاتا ہے اور باقی اجزاء چھوڑتا جاتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ صرف ایمان باللہ کا ہی ذکر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (۴۱ : ۴) جن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے تو ان پر فرشتے نازل ہوں گے۔

متعدد مقامات پر محض اللہ اور آخرت پر ایمان کا ہی ذکر ہے:۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ (۲ : ۸) جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لایا اور اعمال صالح کیے، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔

کہیں خدا و رسول پر ایمان کی دعوت دی گئی ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (۴ : ۱۸) پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔

ایک جگہ اللہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ اور قرآن پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے:۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا (۶۴ : ۲) پس ایمان لاؤ اللہ پر۔ اور اس کے رسول پر۔ اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔

غرض کہ مختلف مقامات پر مختلف اجزاے ایمان کا ذکر ہے اور اس سے ہرگز ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ ایمان کے اجزار ایک دوسرے سے الگ کیے جا سکتے ہیں اور صرف ایک یا دو اجزار پر ایمان لانا مومن ہونے کے لیے کافی ہے۔ اجزار ایمان کو بعض مقامات پر الگ الگ بیان کرنے سے مقصود صرف یہ ہے کہ موقع ومحل کی مناسبت سے بعض اجزائے پر خاص طور سے زور دیا جائے۔ ورنہ درحقیقت اصل مطالبہ تمام اجزائے ایمان کا مشترک طور پر ہے، اور ان میں سے کسی ایک کا کفر بھی سب کا کفر ہے۔ مثلاً سورہ توبہ میں ان منافقین کے مقابلہ میں، جو مختلف حیلہ جوئیوں اور عذر تراشیوں سے کسی نہ کسی طرح جہاد سے بچکر نکل جانے کی سوچ میں رہا کرتے تھے، ان مومنین کا ذکر ہے جو میدان جہاد میں جم کر کھڑے ہوتے اور کبھی واپس آنے کی اجازت نہ مانگتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی مسلمان تھے جن کا خدا و آخرت کے ساتھ، قرآن اور رسول اللہ پر بھی محکم ایمان تھا، لیکن ان کے متعلق فرمایا:-

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ۔ اِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ۔ (۹: ۷)	جو لوگ اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے مال وجان سے جہاد کرنے کے بارے میں آپ سے اجازت نہ مانگیں گے اور اللہ متقیوں کو جانتا ہے۔ جہاد میں نہ جانے کے لیے صرف وہی لوگ آپ سے رخصت مانگیں گے جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ سو وہ اپنے شک ہی میں حیران وسترددہیں۔

ظاہر ہے کہ اگرچہ ذکر صرف ایمان باللہ اور آخرت کا ہے لیکن مقصد ایسے ہی ایمان سے ہے جیسا ان مجاہد مسلمانوں کا تھا۔ اور ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں کہ قرآن پاک نے جہاں ایجاز واختصار سے بھی کام لیا ہے وہ بھی اس کے حکیمانہ انداز بیان پر دلالت کرتا ہے مطلب اس سے یہ ہے کہ اگرچہ قرآن کریم میں ان

اجزاے ایمان میں سے ذکر کسی ایک یا ایک سے زیادہ کا ہو لیکن مقصود ہمیشہ تمام اجزاے ایمان ہوں گے، ایک کی کمی بھی کفر لازم کردے گی۔

ان اجزاے ایمان میں سے جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے، ایمان باللہ وملائکہ ویوم آخر محل نظر نہیں کیونکہ یہ اجزائے ایمان اہل کتاب کے ہاں بھی موجود ہیں خواہ کیسی ہی مسخ صورت میں ہوں اور یہ ایک جداگانہ مسئلہ ہے) زیر بحث مسئلہ صرف کتابوں اور رسولوں پر ایمان ہے۔ ہمارے تجدد پسند طبقے کا خیال ہے کہ اہل کتاب اپنے اپنے رسول اور اپنی اپنی کتاب پر ایمان رکھتے ہوئے اور انہی کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہوئے، انہی ثمرات ایمان وعمل سے بہرہ اندوز ہوسکتے ہیں جو قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے، اور شریعت اسلامی کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہوتے ہیں یعنی بحث صرف اتنی رہ جاتی ہے کہ کتب ورسل میں قرآن پاک اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا بھی شامل ہے یا نہیں۔ اور ان کے بغیر ایمان ممکن ہوسکتا ہے یا نہیں۔ یہ امر بدیہی ہے کہ کتب اور انبیاء پر ایمان لانے سے مقصد وحید یہی ہے کہ ان کو منجانب اللہ مان کر ان کے احکام کی اطاعت اور ان کے طریقے کی پیروی کی جائے، ورنہ ان پر محض ایمان لے آنا۔ تو کچھ معنی نہیں رکھتا۔ (جیسا ہمارے ہاں برہمو سماج والے ایمان رکھتے ہیں)۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللهِ۔ (۴: ۹) اور کسی رسول کو ہم نے نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ بحکم الٰہی اس کی اطاعت کیجائے۔

اور قرآن کریم کے متعلق فرمایا۔

اِتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (۷: ۳) جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اسی کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیا کی پیروی نہ کرو

اصل بحث تک آنے سے پیشتر ایک نظریہ بھی دیکھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم جس چیز کو دین یا اسلام

کے نام سے پیش کرتا ہے اسکی اصلیت کیا ہے۔ قرآنی تعلیم کا اس باب میں مفہوم یہ ہے کہ اسلام اس ہدایت اور روشنی کا نام ہے جو نوع انسانی کو ہلاکت و بربادی سے بچا کر ایک ایسے سیدھے راستے پر لگا دے جو اسے اس منزل مقصود تک بلا خوف و خطر پہنچا دے جو حیات انسانی کا منتہی ہے۔ یہ روشنی مختلف زمانوں میں مختلف اقوام عالم کے (مد) حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے اہل عالم تک پہنچتی رہی لیکن یا تو انسانی دسیسہ کاریوں کی وجہ سے اس کی صورت مسخ ہوجاتی رہی یا نسیان کی بدولت فراموش کر دی جاتی رہی، حتیٰ کہ خدائے واحد کا سچا پیغام وحید رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے قرآن کی صورت میں دنیا میں آیا۔ اور اس کی حفاظت خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی۔ گویا قرآن کریم قانون الٰہی کے صحائف کی (Latestedition) ہے اور ایسی ایڈیشن ہے کہ اس کے بعد اس میں نہ تو کسی تغیر و تبدل کی ضرورت ہے اور نہ تحریف و الحاق کا امکان ہے۔ ظاہر ہے کہ نزول قرآن کے وقت دنیا میں بہت سی ایسی قومیں موجود تھیں جن کے پاس یہ روشنی اس سے قبل آچکی تھی اور وہ کسی نہ کسی منہاج و شریعت، آئین و قانون کی حامل ہونے کی مدعی بھی تھیں لیکن قرآن کا یہ دعوی ہے کہ جس روشنی کو یہ لوگ شمع الٰہی کی کرنیں اور سراج منیر کی شعاعیں سمجھ رہے ہیں، اس پر ذہن انسانی کے رنگین فانوس چڑھے ہوئے ہیں، اس لیے وہ اپنے اصلی رنگ اور حقیقی پیکر میں دنیا کی کسی قوم کے پاس موجود نہیں، بنی اسرائیل اس دعوے میں جملہ اقوام عالم کے پیش پیش تھے۔ اُن کے متعلق جا بجا قرآن کریم میں مذکور ہے کہ انہوں نے توریت میں اختلافات ڈالے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتُلِفَ فِيهِ (۶:۴۱) — ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ سو اس میں اختلافات ڈالے گئے

تحریفات پس کچھ حصہ بھلا بھی دیا۔

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ (۵: ۳) — وہ کلمات کو ان کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں اور جو کچھ ان کو یاد دلایا گیا تھا اس میں سے ایک حصہ انہوں نے بھلا دیا۔

کتمان حقیقت بھی کی جاتی تھی۔

تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا - (۶ : ۱۱)	تم اس کو الگ الگ ورق بنا رکھتے ہو کچھ ظاہر کرتے ہو اور زیادہ تر چھپاتے ہو۔

الحاق بھی کرتے تھے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا - (۲ : ۹) -	افسوس ہے ان پر جو کتاب اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس سے تھوڑی سی قیمت حاصل کریں۔

قرآن کا ہر دعوی حقیقت پر مبنی ہے۔ آج جبکہ دنیا میں اس قدر علمی ریسرچ ہو رہی ہیں۔ دس دس ہزار سال پیشتر کی تہذیب و تمدن کے آثار کھود کھود کر نکالے جا رہے ہیں، دنیا کی کوئی قوم اپنی کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں پیش کر سکی جس کے متعلق وہ خود حتمی طور پر کہ سکے کہ اس مذہب کے بانی نے اسے اسی شکل میں دنیا کو دیا تھا۔ یورپ نے آج ان زبانوں تک کی تحقیق کر لی ہے، جن کا سمجھنے والا دنیا میں کوئی باقی نہیں رہا۔ اور باوصف اس امر کے کہ مذہب عیسائیت، اسلام کے سوا، دنیا میں قریب ترین زمانے کا مذہب ہے، انجیل کا اصل نسخہ آجتک ان کے ہاتھ نہیں لگا۔ یورپ کے پاس سب سے پرانی کتاب وہی ہے جسے سال گذشتہ روس سے لاکھوں روپے کے عوض خرید اگیا ہے لیکن وہ بھی جناب مسیح علیہ السلام سے تین سو برس بعد کی لکھی ہوئی ہے۔ باقی اقوام عالم کا اس سے اندازہ لگا لیجیے۔ ایک طرف تو دنیا کی مذہبی کتابوں کی یہ حالت اور دوسری طرف غیر مسلم مؤرخین تک کی شہادت موجود ہے کہ قرآن کریم اپنے ایک ایک لفظ اور ایک ایک نقطہ کی صحت کے ساتھ دنیا میں چلا آرہا ہے۔

یہ ہے وہ ایمان جو کتب و رسل کے بارے میں قرآن کریم پیش کر رہا ہے۔ جو لوگ دنیا میں ہدایت انسانی کے لیے کسی آسمانی روشنی کی ضرورت کے قائل نہیں، ان سے تو تخاطب نہیں، لیکن جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ انسانی سعادت و نجات کے لیے وحی ربانی کی ضرورت لاینفک ہے، وہ ذرا غور فرمائیں کہ جب تمام اقوام عالم معترف ہیں کہ ان کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس کی بنا پر وہ وثوق کے ساتھ کہہ سکیں کہ ان کے پاس جو تعلیم

وہ بلا تحریف و الحاق آسمانی ہے تو ایسی مشکوک تعلیم نجات و سعادت کی کفیل کیسے ہو سکتی ہے اس کے برعکس قرآن اپنے دعوے کے ثبوت میں خود ایک زندہ شہادت دنیا کے سامنے موجود ہے۔ اور پھر قرآن کے سوا جتنی مذہبی کتابیں آج دنیا میں موجود ہیں کسی ایک میں بھی یہ دعویٰ نہیں ملتا کہ ان کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہو۔

اس مقدمہ کو پیش کرنے کے بعد اسلام کا یہ مطالبہ ہے کہ حقیقی اور یقینی علم آچکنے کے بعد۔ (وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ۔ ۶۹:۲۰ - اور بے شک یقینی حق ہے) ظنی اور قیاسی تعلیم کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ (وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔ ۱۰:۳۶ - اور حق کے مقابلہ میں ظن و قیاس کچھ فائدہ نہیں دے سکتا)۔ اس لیے یہ مانتے ہوئے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام اپنے اپنے وقتوں میں خدا ہی کی طرف سے یہ پیغامات لائے تھے۔ جو دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ قرآن کریم پر اس لیے ایمان لانا ضروری ہے کہ اس میں وہ تمام پیغامات اپنے اصلی اور حقیقی رنگ میں موجود ہیں۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (۵:۴۸) — اور ہم نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان کی محافظ بھی۔

یہ ہے قرآن کریم کا ایمان کتب و رسل سے مفہوم

بعض حضرات کہا کرتے ہیں کہ جب قرآن اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے تو پھر ان کو منسوخ العمل کیوں قرار دیتا ہے لیکن وہ اس امر کو نہیں سمجھتے کہ قرآن تصدیق تو کرتا ہے ان اصلی پیغامات کی جو حضرات انبیاء کرام علیہ السلام دنیا میں لاتے رہے اور وہ تنسیخ کرتا ہے ان کتابوں کی جو انسانی ہاتھوں نے اصلی کتابوں کے نام سے دنیا میں پیش کر رکھی ہیں۔ ورنہ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن ان کتابوں کی ہی تصدیق کرتا ہے جو اہل کتاب کے پاس موجود ہیں تو ایسے کس طرح سے تسلیم کیا جائے گا کہ ایک طرف تو وہ اہل کتاب کے خلاف الزام پر الزام عائد کئے جا رہا ہے (جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں) کہ وہ تحریفات کرتے ہیں، اختلافات ڈالتے ہیں،

چھپاتے ہیں، الحاق کرتے ہیں، اور دوسری طرف انہی تحریف شدہ صحائف کی تصدیق بھی کر رہا ہے ایک طرف تو اس کا دعویٰ ہے کہ یہ لوگ خود اپنے ہاتھوں سے لکھ کر پھر غلط دعویٰ کرتے ہیں ھذا من عند اللہِ (یہ اللہ کی طرف سے ہے) اور دوسری طرف انہی کے لکھے ہوئے پر مہر تصدیق بھی ثبت کر رہا ہے کہ فی الحقیقت یہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ قرآن ایسی شاعری سے بلند ہے۔ یہ محض ذہن انسانی کا ہی فریب ہے۔

اب دیکھیے کہ قرآن کریم جس ایمان کا مطالبہ کرتا ہے وہ یہی ہے یا اس میں کسی کا استثناء بھی ہے۔ قرآن کریم کا پہلا ورق الٹیے۔ فاتحۃ الکتٰب کے بعد سب سے پہلے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ مفلحون کون ہیں یعنی فلاح و نجات۔ کامیابی اور کامرانی کن کے لیے ہے۔ فرمایا۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ (۲ : ۱)

اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا ہے۔

اس میں اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کی کوئی تخصیص نہیں۔ اس کے بعد دیکھیے کہ خاص اہل کتاب کے متعلق فرمایا۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَیَکْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَہٗ (۲ : ۱۱)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس پر جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اس پر ایمان لائینگے جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس سے انکار کرتے ہیں

ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم سے تمام برکات اس لیے چھن گئی ہیں کہ توریت و انجیل تو تمہارے پاس رہی نہیں جس پر تم قائم رہتے۔ اور قرآن پر تم ایمان نہیں لاتے۔ اگر توریت و انجیل یہی محفوظ ہوتیں تو ان پر قائم رہنے سے یہ برکات بھی باقی رہتیں۔ لیکن اب تو سوائے قرآن کریم پر ایمان لانے کے، جو توریت و انجیل کی سی سچائیوں پر مشتمل ہے، اور کوئی ذریعہ کامیابی نہیں ہو سکتا۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۵ : ۱۰)

کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب تم کسی دین پر نہیں ہو تاوقتیکہ توریت کی اور انجیل کی اور جو کتاب تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اس کی پابندی نہ کرو۔

اور دوسری جگہ ہے کہ۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (۵ : ۶)

اگر یہ لوگ توریت و انجیل کی اور جو کتاب اُن کے رب کی طرف سے ان پر نازل کی گئی ہے اس کی پابندی کرتے تو یہ لوگ اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے

حقیقت یہ ہے کہ اگر توریت و انجیل کی سچی تعلیم پر یہ لوگ کاربند رہتے تو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرلیتے کیونکہ ان کتابوں میں صریح پیش گوئیاں موجود تھیں کہ نبی آخرالزماںؐ عرب میں مبعوث ہوں گے، اور حکم دیا گیا تھا کہ جب وہ نبی تشریف لے آئیں تو ان کی پیروی کرنا۔ یہ ہے توریت و انجیل پر قائم رہنے کا مطلب۔

پھر مومن کی تعریف ہی یہ فرمائی کہ جو قرآن کریم پر ایمان رکھتا ہو۔ اور اس کی تخصیص فرما دی

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷ : ۱)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور جو اس پر ایمان لائے جو محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے کہ وہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے اللہ ان کے گناہ ان پر سے اتار دیگا اور ان کی حالت درست رکھے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ حقائق دنیا میں کبھی مختلف نہیں ہوا کرتے۔ دو اور دو آج بھی اسی طرح چار ہیں جس طرح فیثا غورث کے زمانے میں تھے ایرانی بھی اس کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح سے یونانی۔ اختلافات اس لیے موجود تھے کہ ان کے پاس حقیقت موجود نہ تھی۔ اور قرآن کا۔ بہ حیثیت حقیقت یہ منصب ہے کہ وہ ان

اختلافات کو مٹائے۔ فرمایا۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۲۷:۶)

بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر ان باتوں کی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔

ایک بنی اسرائیل ہی نہیں، تمام اقوام عالم کے اختلافات مٹانے کے لیے بھی ایک حقیقت ہے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ۔ (۸:۱۶)

اور ہم نے یہ کتاب تیری طرف صرف اس لیے اتاری ہے کہ جن چیزوں میں انھوں نے اختلاف کیا انکی حقیقت ظاہر کردے

اختلافات لاعلمی کے اندھیرے کی وجہ سے ہوتے ہیں"

اور قرآن ایک مشعل علم و حقائق ہے اس لیے وہی تمام نوع انسانی کو (بلا تمیز اہل کتاب و غیر اہل کتاب) اس اندھیرے سے روشنی کی طرف لانے والا ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (۱:۱۴)

یہ ایک کتاب ہے جس کو ہمنے تیری طرف اتارا ہے کہ تو لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف نکال لائے۔

کتب سماویہ کے حامل اپنی تعلیم کو خاص اقوام اور خاص ممالک تک محدود سمجھتے ہیں۔ برہمن اس شودر کے کان میں سیسہ گلا کر ڈالدیتا ہے جو وید (بلکہ سنسکرت کا ایک لفظ بھی) سن پائے۔ توریت صرف بنی اسرائیل کے لیے ہے۔ انجیل بیٹوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈالنا چاہتی اور جناب مسیح علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے بتائے جاتے ہیں لیکن قرآن کی دعوت مکان و زمان کی حدود سے مقید نہیں۔ اس کا اعلان ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (۱:۲۵)

برکت والی ہے وہ ذات جس نے یہ فیصلہ کرنے والی کتاب اپنے بندے پر نازل کی ہے کہ وہ تمام جہانوں کے لئے ڈرانیوالا ہو۔

دوسری جگہ ہے:-

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا - (۴: ۲۴)

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آچکی ہے۔ اور ہم نے تمہارے پاس ایک صاف روشنی بھیجی ہے۔ جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں اور اس کو مضبوط پکڑیں، ان کو اللہ اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور اپنے تک انکو سیدھا راستہ بتادیگا۔

دیکھیے اس میں تمام نوع انسانی کو مخاطب کیا گیا ہے اور خدا تک پہنچنے کا رستہ قرآن کریم سے اعتصام ہی بتایا گیا ہے۔ سورۂ یونس میں ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (۱۰: ۱۱)

کہہ دیجیے کہ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے حق پہنچ چکا ہے۔ پس اب جو شخص راہ راست پر آجائیگا وہ اپنے نفع کے واسطے راہ راست پر آئیگا اور جو گمراہ ہوگا اس کا وبال اُسی پر پڑیگا۔

کتاب پر ایمان اور رسول پر ایمان دراصل ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص قرآن کریم کو تو منجانب اللہ مانے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول نہ مانے۔ یا رسول اللہ کو مامور من اللہ تسلیم کرے اور قرآن کو خدا کی کتاب نہ جانے۔ اس لیے کہیں تو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت ہے اور کہیں رسول پر۔ اور کہیں دونوں مذکور ہیں۔ پھر مخاطب اس دعوت کے اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سب ہیں اسی دعوت کو دعوت اسلام قرار دیا گیا ہے۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا

اے محمد ان سے بھی کہو جو اہل کتاب ہیں اور ان سے بھی جو ان پڑھ ہیں یعنی غیر اہل کتاب کیا تم اسلام لائے ہو؟ اگر وہ اسلام لے آئے تو راہ راست پر آگئے

وَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ (۳: ۲۰) اور اگر انہوں نے روگردانی کی تو تمہارے اوپر صرف پیغام پہونچا دینے کی ذمہ داری ہے

اب دیکھیے کہ اسلام کیا ہے اور قرآن کی رو سے مُسلم کی کیا تعریف ہے؟ اسی سورۃ (آل عمران) کے نویں رکوع میں فرمایا ہے:۔

"جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں، پھر تمہارے پاس وہ پیغمبر آئے جو مصدق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے۔ تو تم ضرور اس پر ایمان بھی لانا اور اس کی مدد بھی کرنا۔ فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا؟ اور اس پر میرا عہد قبول کیا؟ وہ بولے ہم نے اقرار کیا۔ ارشاد ہوا کہ گواہ رہنا۔ اور میں بھی اس پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ سو جو شخص اس کے بعد روگردانی کرے گا، تو ایسے لوگ فاسقین میں سے ہیں۔ تو کیا پھر یہ لوگ دین خداوندی کے سوا کسی اور دین کو چاہتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کے سامنے سب سر جھکائے ہوئے ہیں جتنے آسمان اور زمین میں ہیں، طوعاً و کرہاً۔ اور سب خدا ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ فرما دیجیے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر جو ابراہیم و اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب کی طرف بھیجا گیا۔ اور اس پر بھی جو موسیٰ اور عیسیٰ اور تمام انبیاء کو دیا گیا ان کے رب کی طرف سے ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے لیے مسلم ہیں۔ اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کریگا تو وہ اس سے مقبول نہیں کیا ہوگا۔ اور وہ آخرت میں سخت نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔"

انبیاء سے عہد لینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی وساطت سے ان کی امتوں سے عہد لیا گیا چنانچہ کتب سماوی کے بچے کھچے حصے آج بھی ملتے ہیں ان سے بھی پتا چلتا ہے کہ ہر نبی نے اپنی امت کو قرآن اور رسول عربی پر ایمان لانے کی تاکید کی تھی انجیل برنباس (جسے عیسائی دنیا ایک مدت تک چھپاتی رہی ہے اور بالآخر ایک عجیب طریقے سے باہر آئی ہے) میں تو حضور کا اسم گرامی اور جملہ حالات تک موجود ہیں پھر اسلام کے ایمان میں تمام انبیاء و کتب سماوی پر ایمان

لانے کی شرط ہے۔ اس کا ایک جزو بھی ساقط ہو جائیگا تو ایمان نہیں رہیگا۔ کفر ہو جائیگا۔ اہل کتاب قرآن اور محمد پر ایمان لانے سے کب تیار ہیں؟ اور اگر وہ ایمان لے آئیں تو پھر جھگڑا ہی کیا باقی رہ جاتا ہے۔ اہل کتاب یہی کرتے ہیں نا کہ وہ بعض پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں اور بعض پر نہیں لیکن دیکھیے قرآن کریم اس قسم کے ایمان کے متعلق کیا فرماتا ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا۔ (۴: ۲۱)	جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعضوں پر تو ایمان لاتے ہیں اور بعضوں پر نہیں لاتے اور یوں چاہتے ہیں کہ اس کے بین بین کوئی راہ تجویز کریں ایسے لوگ پکے کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے سب رسولوں پر اور ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے ان لوگوں کو ضرور اللہ ان کے اجر عطا کرے گا۔ اور اللہ بڑی مغفرت والا مہربان ہے۔

خیال فرمایا آپ نے کہ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا (یہ لوگ بلا شک و شبہ پکے کافر ہیں) کن کے متعلق ہے؟ ان کے نہیں جو دنیا میں کسی پیغمبر کی امت نہیں ہیں بلکہ ان کے لیے ہے جو کسی نہ کسی پیغمبر پر تو ایمان رکھتے ہیں، لیکن باقی پیغمبروں پر ایمان نہیں رکھتے اور اس طرح خدا کے رسولوں میں تفریق کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف رسولوں کا ہی انکار ہے بلکہ خود خدا کا انکار ہے کہ بھیجنے والا تو کہہ رہا ہے کہ یہ ہماری طرف سے مرسل برحق ہے اور یہ اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ رسول کی تکذیب خود اس کے بھیجنے والے کی تکذیب ہے۔ خدا کو خدا اور رسول کو رسول سمجھنا یہ تفریق تو البتہ ضروری ہے۔ لہذا محولہ صدر آیات میں

جس تفریق کو کفر کہا گیا ہے اس سے مراد یہ تفریق ہے کہ یا تو تمام رسولوں کو چھوڑ کر صرف خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا جائے۔ یا بعض رسولوں کو چھوڑ کر بعض کی رسالت کا اقرار کیا جائے۔ یہی تفریق کفر صریح ہے۔

بعض لوگ کہدیا کرتے ہیں، کہ جس طرح مسلمان حضرت موسیٰ و عیسیٰ و دیگر انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ منجانب اللہ تھے لیکن اتباع صرف محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی کرتے ہیں، اسی طرح عیسائی اور موسائی اگر محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو منجانب اللہ سمجھیں لیکن اتباع اپنے ہی مذہب کا کرتے رہیں تو اس میں کیا فرق ہے؟ بظاہر یہ اعتراض معقول نظر آتا ہے مگر غور کرنے سے اس کی غلطی بآسانی واضح ہو جاتی ہے اول تو یہ کہ قرآن کریم نے ان انبیاء کرام اور ان کی کتب کے متعلق صرف تصدیق و ایمان کا حکم دیا ہے اتباع کا حکم نہیں دیا اس لیے کہ وہ کتابیں دنیا سے ناپید ہیں جس ایمان میں اتباع شامل ہے وہ ایمان صرف قرآن و محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی ہے اور تمام انبیاء کرام کی امتوں کے لیے حکم ہے کہ وہ قرآن ہی کا اتباع کریں کیونکہ نیا قانون پاس ہونے کے بعد پرانا قانون اور نیا وائسرائے آنے کے بعد پرانا وائسرائے قابل اطاعت نہیں رہتا۔ دوسرے یہ کہ عیسائی اور موسائی اگر اتباع کر رہے ہیں تو خود ساختہ اپنے بنائے ہوے دین کا اتباع کر رہے ہیں نہ کہ حضرت عیسےٰ و موسیٰ علیہما السلام کا جیسا کہ خود قرآن اور تاریخ سے ثابت ہے موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام کا دین تو قرآن ہی کے اندر ہے اس کے باہر کہیں اور موجود نہیں لہذا نزول قرآن کے بعد انبیاء سابقین پر ایمان کے معنی ہی یہ ہوں گے کہ قرآن پر ایمان لایا جائے اور اسی کا اتباع کیا جائے اگر ایسا نہ کیا جائے تو تمام انبیاء سے کفر ہے۔ حضرت عیسیٰؑ و موسیٰؑ کی طرف محض نسبت کر لینے سے تو ان پر ایمان نہیں آسکتا۔ اگر ایک عیسائی سمجھتا ہے کہ نبی اکرمؐ بھی خدا کی طرف سے ایسے ہی سچے پیغمبر ہیں جیسے حضرت عیسیٰؑ تھے تو پھر اسے نبی کریم کی تعلیم سے نفرت کیوں ہو! درانحالیکہ خود اس کی علمی ریسرچ اسے بار بار یقین دلا رہی ہو کہ عیسیٰ مسیح کی تعلیم مسخ ہو گئی اور قرآن اپنی اصل شکل میں، بلا شائبہ تحریف والحاق موجود ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کہدینا کہ ایک عیسائی یا یہودی نبی اکرمؐ کو اسی طرح منجانب اللہ مانتے

جس طرح ایک مسلمان حضرت عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کو مانتا ہے، ایک مفروضہ ہی مفروضہ ہے جس کی تصدیق کسی زمانے میں کسی متنفس نے نہیں کی عیسائی مصنفین نے زیادہ سے زیادہ حضورؐ کو ایک "راستباز انسان" قرار دیا ہے لیکن آپ کو ایک "راستباز انسان" ماننا اور آپ کے دعوائے رسالت کو نہ ماننا صریح تناقض ہے۔ جو لوگ آپ کے اس دعویٰ کو نہیں مانتے وہ درحقیقت آپ کو راستباز کیا معنیٰ دنیا کا سب سے بڑا جعل ساز قرار دیتے ہیں اگرچہ زبان سے آپ کی راستبازی کا وہ کتنا ہی اقرار کرتے ہوں۔ پھر اسی طرح وہ قرآن کی بھی کھلی ہوئی تکذیب کرتے ہیں کیونکہ قرآن تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا دعویٰ بڑے زور سے پیش کرتا ہے اور اس پر ایمان لانے کا سخت مطالبہ کرتا ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَكُمْ ۚ فَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (۴: ۲۳)

اے لوگو! یہ رسول تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ٹھیک ٹھیک حق لے کر آیا ہے۔ اب اگر تم ایمان لے آؤ تو تمہارے ہی لیے بہتر ہوگا۔ اور اگر تم منکر رہے تو خدائے تعالیٰ کی تو ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے (اس کا تمہارے کفر سے کیا نقصان ہوگا)۔

دوسری جگہ رسالت نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہے:۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۷: ۲)

کہدیجیے کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین پر ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی مارتا ہے وہی زندہ کرتا ہے پس ایمان لاؤ تم اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر جو خود اللہ پر اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کا اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

نوع انسانی کو خطاب ہے رسالت نبی امیؐ کی دعوت تمام افراد انسانی کے لیے ہے اور اللہ کے ساتھ نبیؐ پر بھی ایمان لانے کا حکم ہے۔ ایمان ایسا جس میں اتباع ضروری ہے کہ اصل ہدایت صرف اسی نبی امیؐ کے

اتباع سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی اور واضح حکم مطلوب ہے۔

اب خاص اہل کتاب کو مخاطب کیا گیا ہے۔ فرمایا:۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۵ : ۲)

اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارے یہ رسول آئے ہیں۔ تم کتاب میں سے جن باتوں کو چھپاتے ہو ان میں سے بہت سی باتوں کو صاف طور پر تمہارے سامنے کھول دیتے ہیں اور بہت سے احکام سے معاف بھی کر دیتے ہیں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور کتاب مبین آئی ہے، کہ اس کے ذریعہ سے اللہ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہ بتاتا ہے، اور اس کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے اور ان کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

اہل کتاب کے لیے رسول اللہ پر ایمان لانا کس قدر ضروری ہے اس کا اندازہ قرآن کریم کی ان آیات سے کیجیے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی ہے کہ اے اللہ میری قوم کو اس دنیا میں بھی خیر و برکت عطا فرما اور آخرت میں بھی نجات و سعادت۔ جواب ملا کہ ہماری رحمت ہر چیز کو محیط ہے لیکن ورود رحمت کے لیے کچھ شرائط بھی مقرر ہیں۔ اور وہی لوگ اس سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں جو ان شرائط کو پورا کرتے ہیں۔ فرمایا:۔

فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ .... مُفْلِحُونَ۔ (۷ : ۱۹)

وہ رحمت تو میں ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جو خدا سے ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں یعنی وہ لوگ جو نبی امی کا اتباع کریں جس کو وہ لوگ توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو نیک باتوں کا حکم دیتا ہے، بری باتوں سے منع کرتا ہے

پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا ہے اور گندی چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے، اور ان لوگوں کے جو بار تھے اور جو پھندے ان پر پڑے ہوئے تھے ان کو دور کرتا ہے سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی حمایت کرتے ہیں، اور اس کی مدد کرتے ہیں۔ اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔

کس قدر صاف اور بین احکام ہیں اور کتنا کھلا ہوا اسلوب بیان ہے۔ واضح کر دیا گیا کہ اہل کتاب اگر اپنی ہی کتابوں کو دیکھ لیں تو (با ایں ہمہ تحریف و کتمان) اس میں رسول اکرم کی تشریف آوری کی پیش گوئیاں موجود ہیں، بعثت نبوی کے بعد رحمت الٰہی کا نزول اتباع رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشروط ہو چکا ہے اور اہل کتاب کو اس کی اطلاع بھی دی جا چکی ہے۔ پھر اتنا ہی نہیں کہ صرف ایمان لانے کا ہی ذکر ہو، بلکہ حلال و حرام میں اتباع رسول ضروری قرار دیا گیا ہے، اور قرآن کریم کی پیروی سے فلاح و نجات وابستہ کر دی گئی ہے ایسے واضح احکام کی کیا تاویل ہو سکتی ہے؟ اور معترضین ان آیات سے کیا مفہوم لیتے ہیں؟ اگر اس کے بعد بھی کوئی شبہ باقی رہ جاتا ہے تو فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ۔ (باقی)

تنزیل وتاویل

عالم برزخ

از

از جناب مولانا اسلم جیراج پوری

اس عنوان پر میں نے اپنی کتاب "تعلیمات قرآن" سے اخذ کر کے ایک مضمون سال گزشتہ رسالہ جامعہ میں شائع کیا تھا بعض حضرات نے رسالہ معارف اعظم گڑھ میں اس کے جوابات لکھے لیکن انہوں نے بجائے اس کے کہ قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی میں بحث کرتے محض اپنے تقلیدی خیال کی حمیت میں اس کی تردید کی کوشش کی۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ہر زمانہ میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے مروجہ آبائی خیالات کو برحق سمجھتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے اتارا ہے اس کی قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَا وَجَدۡنَا عَلَیۡهِ اٰبَآءَنَا پیروی کرو تو وہ (کہتے ہیں) بلکہ ہم تو اس کے پیچھے چلیں گے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے۔ ۲۱/۳۱ [1]

مگر مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ آپ "ترجمان القرآن" کے مدیر اور قرآن کی حمایت و نصرت و اشاعت کا دعویٰ رکھتے ہوئے بھی انھیں لوگوں کے ہم خیال ہیں اور ان کے جوابوں کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ان قرآنی تعلیمات کو پھر ایک بار وضاحت مگر اختصار کے ساتھ لکھ

[1] ہر جگہ اوپر آیت کا شمار ہے نیچے سورۃ کا

آپ کے رسالہ میں بھیجوں تاکہ آپ ان کو غور سے دیکھ لینے کے بعد ان پر علیٰ وجہ البصیرۃ بحث کر سکیں۔

رسالہ معارف کے جوابات پر میں نے کچھ لکھنا اس وجہ سے پسند نہیں کیا کہ ان میں سے کسی کا طرز نگارش جس سے آپ نے بھی نفرت کا اظہار کیا ہے اس قابل نہ تھا کہ ان سے قرآنی بحثیں کی جائیں۔

چونکہ اس بحث کا عنوان یہ ہے کہ "برزخ کے متعلق قرآن کریم کیا تعلیم دیتا ہے" اس لیے اس پر جو کچھ لکھا جائیگا خالص قرآن ہی سے لکھا جائیگا۔

برزخ کا لفظ قرآن میں روک یا آڑ کے معنی میں مستعمل ہے۔

وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَحْجُورًا ۵۳/۲۵ — اور اللہ نے ان دونوں (شور و شیریں سمندر) میں آڑ رکھ دی اور رکاوٹ کی اوٹ۔

دوسری جگہ بجائے برزخ کے حاجز کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۶۱/۲۷ — اور اللہ نے دونوں سمندروں میں آڑ رکھ دی ہے تاکہ وہ دونوں اپنے اپنے حدود سے آگے نہ بڑھیں۔

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ ۲۰/۵۵ — دونوں سمندروں کے درمیان آڑ ہے جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہی معنے برزخ کے اس آیت میں ہیں۔

وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۱۰۰/۲۳ — اور ان (مرنے والوں) کے آگے آڑ ہے اس دن تک کہ جس دن وہ اٹھائے جائیں گے۔

یعنے برزخ کی مدت مرنے والوں کی موت سے لیکر حشر تک ہے کہ اس میں وہ اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جائیں گے اور جب حشر ہوگا اللہ کے سامنے حاضر کر دیے جائیں گے۔

إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ ۵۳/۳۶ — بس ایک شور ہوگا اور ہمارے پاس وہ سب کے سب حاضر کر دیے جائیں گے۔

شہداء یعنے مقتولین "فی سبیل اللہ" جن کی زندگی کی قرآن نے تصریح فرما دی ہے وہ برزخ یعنے آڑ میں نہیں بلکہ "عند ربہم" اپنے رب کی حضوری میں ہیں جہاں ان کو نئی زندگی ملتی ہے اور وہ روزی پاتے ہیں

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۳/۱۶۹

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ ہرگز نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کی حضوری میں روزی پاتے ہیں

یہ عالم برزخ جس میں شہداء کے سوا باقی مردے رکھے جاتے ہیں قرآن کے نزدیک مطلق عالم ممات ہے جس میں حیات کا کوئی شائبہ نہیں۔ چنانچہ ان اولیاء اور بزرگان کی نسبت جن کو مشرکین پوجتے ہیں قرآن کہتا ہے

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ۔ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُوْنَ أَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۱۶/۲۱

اور وہ اللہ کے ماسوا جن کو پکارتے ہیں۔ وہ کوئی شے پیدا نہیں کرتے ہیں بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ وہ مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں۔ اور انہیں بھی خبر نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔

اس آیت میں جن معبودان ماسوی اللہ کا ذکر ہے وہ بت یا شجر یا شمس یا قمر وغیرہ بے جان چیزیں نہیں۔ کیونکہ ان چیزوں کے لیے نہ اموات کا لفظ مستعمل ہو سکتا ہے نہ احیاء کا۔ بلکہ یہ وہی ان کے بزرگان دین ہیں جن کو مقبول بارگاہ اور متصرف مان کر وہ پوجتے ہیں۔ دوسری آیت میں یہ امر اور بھی واضح ہے

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَافِلُوْنَ۔ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ أَعْدَاءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِيْنَ۔ ۴۶/۶

اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کے سوا ان لوگوں کو پکارتا ہے جو قیامت کے دن تک بھی اس کو جواب نہیں دینے کے۔ اور وہ ان کی پکار سے بے خبر ہیں اور جب لوگ (حشر کے لیے) اٹھائے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی پرستش کا انکار کر دیں گے۔

اس سے جہاں اس بات کی تصریح نکلی کہ معبودان غیر اللہ پکارنے والوں کی پکار سے بے خبر ہیں

وہاں یہ بھی ثابت ہوگیا کہ یہ معبودان بت وغیرہ بیجان چیزیں نہیں ہیں بلکہ وہی بزرگان دین اور مقبولان بارگاہ ہیں۔ جو قیامت کے دن ان کی پرستش کا انکار کردیں گے کیونکہ بیجان چیزوں میں انکار کی قدرت نہیں ہے۔

تیسری آیت میں انھیں معبودان غیر اللہ یعنے بزرگان دین کی سماعت کا انکار ہے۔

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا یَمْلِکُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ اِنْ تَدْعُوْھُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَکُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَکُمْ وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکْفُرُوْنَ بِشِرْکِکُمْ ۲۲/۳۵

اور اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں تم اگر ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے اور جو سنتے بھی تو جواب نہ دیتے اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کردیں گے

اس انکار کی کیفیت قرآن میں کئی جگہ بیان کی گئی ہے۔

وَاِذَا رَاَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا شُرَکَآءَھُمْ قَالُوْا رَبَّنَا ھٰٓؤُلَآءِ شُرَکَآؤُنَا الَّذِیْنَ کُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِکَ ۔ فَاَلْقَوْا اِلَیْھِمُ الْقَوْلَ اِنَّکُمْ لَکٰذِبُوْنَ ۔ ۱۶/۱۶

اور جب مشرکین قیامت میں اپنے شرکا کو دیکھیں گے کہ اے ہمارے رب ایہی وہ شرکا ہیں جن کو ہم تیرے سوا پکارتے تھے وہ (شرکا) ان کو جواب دیں گے کہ تم بالکل جھوٹے ہو۔

دوسری جگہ ہے۔

وَیَوْمَ نَحْشُرُھُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا مَکَانَکُمْ اَنْتُمْ وَشُرَکَآؤُکُمْ فَزَیَّلْنَا بَیْنَھُمْ وَقَالَ شُرَکَآؤُھُمْ مَا کُنْتُمْ اِیَّانَا تَعْبُدُوْنَ ۔ فَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اِنْ کُنَّا عَنْ عِبَادَتِکُمْ لَغٰفِلِیْنَ ۲۹/۱۰

اور جس دن سب کو ہم جمع کریں گے تو مشرکوں سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے شرکا اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو جاؤ پھر ان کے تعلقات کو ہم منقطع کردیں گے ان کے شرکا کہیں گے کہ تم ہم کو نہیں پوجتے تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان میں اللہ شہادت کیلئے کافی ہے کہ ہم تمہاری پرستش سے بے خبر

ان آیات سے جہاں اس امر کا بیّن ثبوت ملتا ہے کہ وہ مشرکین کے معبود ان غیر اللہ ان کے مردہ اولیاء اور بزرگان دین ہی ہیں جن کو وہ مقبولان بارگاہ اور صاحبان قدرت سمجھکر پوجتے تھے وہاں یہ بھی تصریحاً ثابت ہوتا ہے کہ تمام مردے جو برزخ میں ہیں ان میں نہ علم ہے نہ احساس نہ شعور نہ سماعت اور بالکل غافل اور بے خبر ہیں اور قیامت کے دن اپنے پوجنے اور پکارنے والوں کو صاف جواب دیدینگے کہ نہ ہم کو تمہاری پرستش کی خبر تھی نہ تمہاری پکار کی۔

اب ایک دوسری حیثیت سے دیکھیے۔ قرآن کی رو سے انسان کے لیے دو ہی موتیں اور دو ہی زندگیاں ہیں۔ چنانچہ قیامت کے دن کفّار کہیں گے۔

اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ۱۱/۴۰ (اے رب) تونے ہم کو دوبار موت دی اور دوبار زندہ کیا ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ کیا جہنم سے نکلنے کی کوئی سبیل ہے۔

یہ اگرچہ کفار کا قول ہے لیکن حقیقت ہے کیونکہ سورۂ بقرہ میں اللہ فرماتا ہے۔

كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۲۸/۲ تم مردہ تھے اس نے تمکو زندگی بخشی پھر وہ تم کو موت دیگا پھر تم کو زندہ کرے گا۔ پھر تم اس کے پاس لوٹائے جاؤگے

دنیاوی زندگی سے پہلے کی حالت موت سے تعبیر کی گئی ہے جس کے بعد یہ زندگی ملی ہے۔ پھر موت آئے گی پھر اس کے بعد دوسری زندگی ملے گی جس کے لیے موت نہیں ہے۔ اب یہ دوسری زندگی کس دن ملے گی؟ قبر میں یا حشر کے دن؟

قرآن تبلاتا ہے کہ یہ دوسری زندگی حشر کے دن ملے گی۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۱۶/۲۳ پھر تم اس کے بعد مرنے والے ہو۔ پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤگے۔

یعنے انسان کی دوسری زندگی جس کو قرآن میں جابجا اعادہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے قیامت کے دن ملے گی۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ ۔ ۱۰۴/۲۱

جس دن ہم آسمان کو خط کے طومار کی طرح لپیٹینگے (اس دن) تم کو جس طرح پہلی بار پیدا کیا تھا دوبارہ پیدا کریں گے۔

کفار اسی کو مستبعد سمجھتے تھے۔

قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۷۹/۳۶

اس نے کہا کہ کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو جب کہ وہ گل چکی ہوں گی۔ کہدے اے پیغمبر کہ وہی ان کو زندہ کریگا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔

مندرجہ ذیل آیت میں اس کی مزید تصریح ہے۔

قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا أَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَى هُوَ قُلْ عَسَى أَنْ يَكُونَ قَرِيبًا يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ۔ ۵۲/۱۵

کہدے کہ تم (مرنے کے بعد) پتھر یا لوہا یا اور کوئی چیز جو تمہارے خیال میں بڑی ہو بنجاؤ۔ پھر وہ پوچھینگے کہ کون ہم کو دوبارہ پیدا کرے گا۔ کہدے کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا ہے۔ پھر وہ تیری طرف سر ہلائیں گے اور پوچھینگے کہ کب؟ کہدے کہ عجب نہیں کہ (وہ دن) قریب ہو جس دن کہ وہ تمکو پکاریگا اور تم حمد کرتے ہوئے جواب دوگے اور خیال کروگے کہ بہت تھوڑے عرصہ رہے۔

اس آیت میں دوبارہ زندہ کرنے کا دن تبلایا گیا کہ جس دن تم پکارے جاؤگے اور اس پکار کی تعمیل کروگے اور جس دن کہ تم گمان کروگے کہ نہیں رہے مگر تھوڑی دیر تک۔ یہ دن حشر کا دن ہوگا۔

يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَى شَيْءٍ نُكُرٍ خُشَّعًا

جس دن پکارنے والا ایک ان دیکھی چیز کو پکاریگا

اَبۡصَارُهُمۡ يَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ كَاَنَّهُمۡ جَرَادٌ مُّنۡتَشِرٌ ﴿۵۴﴾ — تو ان کی آنکھیں خوف زدہ ہونگی اور یہ قبروں سے اسطرح نکلیں گے جیسے بکھری ہوئی ٹڈی ۔

وَيَوۡمَ يَحۡشُرُهُمۡ كَاَنۡ لَّمۡ يَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ ﴿۴۵﴾ — اور جس دن اللہ ان کو اٹھائیگا وہ خیال کرینگے کہ نہیں رہے مگر دن کی ایک گھڑی ۔

اس لیے یہ متعین ہوگیا کہ دوسری زندگی جو انسان کو ملے گی وہ حشر کے دن ملے گی نہ کہ قبر میں لہذا اس دنیاوی زندگی کے منقطع ہوجانے کے بعد اہل برزخ میں مطلقاً زندگی کا کوئی شائبہ نہیں ہے اور زمانہ چونکہ اعتباری شئے ہے اور اہل برزخ میں شعور اور احساس نہیں ہے اس وجہ سے زمانہ کا بھی ان کو احساس نہیں ہے ۔ چنانچہ قیامت کے دن جب وہ اٹھائے جائیں گے تو اپنے خیال میں اپنے آپ کو اسی ساعت اور اسی لمحہ میں سمجھیں گے جس میں ان کی جان نکلی تھی ۔ اور کہنے لگیں گے ۔

يٰوَيۡلَنَا مَنۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا ﴿۵۲﴾ — ہائے ہماری شامت ! کس نے ہمکو ہماری خوابگاہ سے اٹھادیا

یعنے حشر کے وقت وہ اپنے آپکو اپنی خوابگاہ ہی میں سمجھتے ہوں گے جہاں مرض الموت میں مرے تھے اور ان کو اپنے گاڑے یا جلائے جانے کی بھی خبر نہ ہوگی ۔ مرقد کے معنے اس آیت میں قبر کے نہیں ہیں جس میں اردو شعراء اسکو استعمال کرتے ہیں ۔ بلکہ بستر خواب کے ہیں ۔ کیونکہ رقاد کے حقیقی معنے نیند کے ہیں ۔ قرآن کریم میں اصحاب کہف کے قصہ میں یہ لفظ آیا ہے ۔

وَتَحۡسَبُهُمۡ اَيۡقَاظًا وَّهُمۡ رُقُوۡدٌ ﴿۱۸﴾ — اور تو ان کو بیدار خیال کریگا ۔ حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں

الغرض یہ امر قرآن کے نصوص صریحہ سے روز روشن کی طرح ثابت ہوگیا کہ موت اور حشر میں مردوں کے لیے فصل زمانی نہیں ہے ۔ یعنی ان کو اس برزخ کے زمانہ کا مطلق احساس نہ ہوگا ۔ اور جب وہ محشور ہوں گے تو اپنے خیال میں اسی ساعت اور اسی لمحہ میں اپنے آپ کو سمجھتے ہوں گے جس میں ان کی جان نکلی تھی ۔ دوسری آیت میں زمانہ برزخ کی مقدار بمنزلہ ایک گھڑی کے بتائی گئی ہے ۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً
مِنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۴۵

اور جس دن اللہ ان کو اٹھائیگا گویا کہ وہ نہیں رہے مگر دن کی ایک گھڑی اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہونگے

كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ
يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ ۳۵

جس دن وہ اس (حشر) کو دیکھینگے جس سے ان کو ڈرایا جاتا ہے (وہ خیال کریں گے) کہ گویا وہ نہیں رہے مگر دن کی ایک گھڑی۔

ان کا یہ گمان محض تبدیلی حالت کی وجہ سے ہوگا۔ ورنہ وہ حقیقت میں ایک گھڑی بھی نہیں رہے جیسا کہ آیت "یا ویلنا من بعثنا من مرقدنا" سے ثابت کیا جا چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں "کأن" (گویا) کا لفظ تشبیہ مستعمل ہو رہا ہے۔ یعنے حقیقتاً تو وہ اپنے علم میں ایک لحہ بھی برزخ میں نہیں رہے صرف ایسا خیال کریں گے کہ ہم ایک گھڑی رہے ہیں۔ کیونکہ حالت بدلی ہوئی ہوگی۔

مجرمین جن کی نسبت لوگ سمجھتے ہیں کہ برزخ میں رات دن ان پر گرز کی مار پڑتی رہتی ہے اور آگ میں جلتے رہتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے اوپر یہ مدت برزخ بیمار کی رات کی طرح جو بہت دراز ہوتی ہے کروروں سال کی ہونی چاہیے تھی وہ بھی یہی کہیں گے۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ
مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذَٰلِكَ كَانُوا
يُؤْفَكُونَ - وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ
وَالْإِيمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ
إِلَىٰ يَوْمِ الْبَعْثِ فَهَٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ
وَلَٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۵۶

اور جس دن قیامت قائم ہوگی مجرم قسم کھائینگے کہ وہ تو بس ایک گھڑی رہے اسی طرح وہ بھٹکائے جاتے تھے۔ اور جن کو علم اور ایمان دیا گیا ہے وہ کہینگے کہ تم اللہ کے نوشتہ میں رہے قیامت تک۔ سو یہ قیامت کا دن ہے مگر تم نہیں جانتے تھے۔

مجرم تو حشر کے دن قسم کھا کر کہینگے کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے مگر اہل علم و ایمان

ان سے کہیں گے کہ تم اللہ کے نوشتہ میں قیامت تک رہے لیکن تم کو خبر نہ تھی۔ یہ تصریح ہے اُن کے عدم احساس زمانی کی۔ خود ان مومنوں کو بھی احساس نہ تھا جیسا کہ ہم اوپر کی آیتوں سے ثابت کر چکے ہیں مگر اپنے یوم البعث پر عقیدہ رکھنے کے باعث وہ قیامت کے دن کو پہچان لینگے اور کہنے لگینگے کہ برزخ کی طویل مدت تم پر گزر چکی ہے مگر تم کو علم نہ تھا۔

ہماری یہ تمام بحث انسانی جسم کے متعلق نہیں ہے جو سڑ کر اور گل کر عناصر میں ملجاتا ہے بلکہ اس کی روح کے متعلق ہے۔ عالم برزخ میں روح کے بقاء کے متعلق جو کچھ قرآن میں کہا گیا ہے وہ یہی ہے کہ اس کا علم اللہ کے نوشتہ میں ہے جیسا کہ آیت بالا میں اہل ایمان و علم کے قول سے ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری آیت ہے۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ ۲۰

فرعون نے پوچھا کہ گذشتہ نسلوں کی کیا حالت ہے موسیٰ نے کہا کہ انکا علم میرے رب کے پاس نوشتہ میں ہے۔

اس کی تصریح پارہ عم میں ہے۔

إِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّينٍ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سِجِّينٌ كِتَابٌ مَرْقُومٌ

گنہگاروں کا اندراج سجین میں ہے اور تجھے کیا خبر کہ سجین کیا ہے۔ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔

إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا عِلِّيُّونَ كِتَابٌ مَرْقُومٌ

نیکوکاروں کا اندراج علیین میں ہے اور تجھے کیا معلوم کہ علیین کیا ہے وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔

اسی کو سابقہ آیات میں لبثتم فی کتاب اللہ کہا گیا ہے جس سے مراد قیام برزخ کی مدت ہے۔ دوسرا لفظ لبثتم فی الارض ہے جس سے مراد روئے زمین پر رہنے کی مدت یعنی دنیاوی زندگی ہے اس کا بھی قیامت کے دن سوال ہوگا۔ اس کے جواب میں لوگ ایک گھڑی نہیں بلکہ ایک دن کہیں گے۔

قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ قَالُوا

اللہ پوچھیگا کہ تم زمین میں کتنے سال رہے وہ کہیں گے

لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَاسْئَلِ الْعَادِّيْنَ

ایک دن یا اس سے بھی کم ان لوگوں سے پوچھ جو شمار رکھتے ہیں

دوسری آیت میں دس دن کا بھی ذکر ہے۔

يَتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ۔ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ۔ ۱۰۵/۲۰

وہ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ تم نہیں رہے مگر دس دن۔ ہم جانتے ہیں جو کچھ وہ کہیں گے۔ جو سب سے زیادہ روبراہ ہوگا وہ کہیگا کہ تم تو صرف ایکدن رہے۔

ان تمام تفصیلات کے بعد ہم حسب ذیل نتائج پر پہونچتے ہیں جو قرآن کریم سے تصریحاً ثابت ہوئے

(۱) عالم برزخ عالم ممات ہے جس میں نہ مُردوں میں شعور ہے نہ احساس نہ علم نہ سمع نہ حیات کا کوئی شائبہ

(۲) انسان کے لیے دو ہی زندگیاں ہیں اور دو ہی موتیں پہلی زندگی یہ دنیاوی زندگی ہے اور دوسری زندگی حشر کے دن ملے گی۔ برزخ میں زندگی نہیں ہے۔

(۳) اہل برزخ کو زمانہ کا مطلق احساس نہیں ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا چاہیے کہ مرنے والے کے لیے موت ہی کا دن اس کے حشر کا دن ہے۔

ان تصریحات کے ہوتے ہوئے برزخ میں عذاب یا ثواب کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں جہاں عذاب یا ثواب کا ذکر ہے وہاں صرف دنیاوی اور اخروی عذاب و ثواب کا ذکر ہے برزخ کا کہیں نام تک نہیں آیا ہے۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۳۰/۱۶

جن لوگوں نے احسان کیا ہے ان کے لیے اس دنیا میں بھلائی ہے اور دار آخرۃ تو سب سے بہتر ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۔ ۴۱/۱۶

اور جو لوگ ستائے گئے اور اس کے بعد انھوں نے اللہ کیلئے اپنے گھر بار کو چھوڑ دیا ان کو ہم دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے۔ اور آخرت کا اجر اس سے بھی بڑا ہوگا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اِۨطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ اِۨنْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۱۱/۲۲

اور بعض آدمی ہیں جو ایک کنارے پر اللہ کی بندگی اختیار کرتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی بھلائی پہونچگئی تو مطمئن ہوگئے اگر کوئی آزمایش ان پر پڑی تو اپنے رخ پلٹ گئے۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں خسارہ میں رہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۲۲

اور بعض آدمی ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں بلا کسی علم اور بلا کسی روشن کتاب کے جھگڑتے ہیں اپنے پہلو کو موڑے ہوئے تاکہ اللہ کی راہ سے گمراہ کردیں ایسوں کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت کے دن ہم ان کو دوزخ کا عذاب چکھائیں گے

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۸۵/۲

کیا تم اللہ کی کتاب کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے۔ جو کوئی تم میں سے ایسا کریگا اس کا بدلہ دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت کے دن ایسے لوگ سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۱۱۴/۲

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اسکا نام لینے سے روکے اور ان کو اجاڑنے کی کوشش کرے۔ یہ لوگ ان میں داخل نہیں ہونے پائیں گے مگر ڈرتے ہوئے ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۳۴-۳۳/۱۳

اور جس کو اللہ گمراہ کردے اس کو کوئی راہ دکھانے والا نہیں ایسوں کو دنیاوی زندگی میں عذاب ہے اور آخرۃ کا عذاب اور گراں ہے۔

یہ سب آیتیں مختلف قسم کے مجرموں کے عذاب کے متعلق ہیں مگر کسی میں سوائے دنیا اور آخرۃ کے عذاب کے برزخ کے عذاب کا مطلقاً ذکر نہیں۔ اور ہو کیسے جبکہ نہ برزخ میں حیات کا کوئی شائبہ ہے نہ زمانہ نہ عذاب و ثواب کے اثر پذیری کی کوئی صلاحیت۔ یہی وجہ ہے کہ بجز ان چند انفرادی اور اجتماعی اعمال کے جن کی جزا یا سزا لازمی طور پر دنیا میں بھی مل جاتی ہے اور جن کی تصریح مذکورہ بالا آیات اور نیز دیگر آیات قرآنی میں کر دی گئی ہے قرآن کریم نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ دار الجزاء آخرت ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۔ ۱۶/۶۱

اور اگر اللہ لوگوں کا ان کے گناہوں پر مواخذہ کرنے لگتا تو زمین میں کوئی جاندار نہ چھوڑتا لیکن اس نے لوگوں کو ایک مقررہ مدت تک مہلت دے رکھی ہے۔

"اجل مسمیٰ" کونسا دن ہے؟ اس کی تصریح کئی جگہ قرآن میں کر دی گئی ہے۔

لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ لِیَوْمِ الْفَصْلِ ۱۳/۱۲ ـ ۱۷

کس دن کے لیے مہلت دی گئی ہے فیصلہ کے دن کیلیے

یہ فیصلہ کا دن قیامت کا دن ہے۔

وَقَالُوْا یٰوَیْلَنَا هٰذَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۔ هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۲۱-۲۰/۳۷

اور کافر کہیں گے کہ اے ہماری شامت!! یہ انصاف کا دن ہے۔ (ہاں) یہی وہ فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے

اس لیے دنیا کے بعد حساب و کتاب و عذاب و ثواب کا دن قیامت ہی کا دن ہے برزخ نہیں ہے۔ یہاں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اللہ کے یہاں انصاف ہے۔ یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ جس نے حضرت نوح علیہ السلام کا انکار کیا وہ پانچ ہزار برس پہلے سے عذاب سہے اور برزخ میں جلے اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا وہ پانچ ہزار یا دس ہزار برس بعد۔ قرآن کی رو سے دونوں کے لیے فیصلہ کا ایک ہی دن مقرر ہے! اسی دن ان کے اعمال نامے نکالے جائیں گے اور حساب و کتاب ہوگا۔ اور جزا و سزا دی جائے گی۔ برزخ کے زمانے کا دونوں میں سے کسی کو احساس نہ ہوگا۔

اب میں ان چند آیات کو بھی لکھ دیتا ہوں جن سے لوگوں نے غلط فہمی سے برزخ کا عذاب سمجھا ہے

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْکُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّۃَ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

جن کو فرشتے اس حالت میں وفات دیتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں (تو ان سے) کہتے ہیں کہ تمہارے اوپر سلامتی ہو تم جنّت میں داخل ہو ان کاموں کے عوض جو تم کرتے تھے۔

یہ آیت میرے جواب میں ثواب برزخ کے ثبوت میں مولوی ابو الوفا ثناء اللہ صاحب مدیر اخبار اہل حدیث امرتسر نے لکھی ہے۔ جو قرآن کریم کی دو تفسیریں لکھ چکے ہیں۔ مگر انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ یہ آیت خاص دار آخرت کے متعلق ہے۔ برزخ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ قرآن کا سلسلۂ بیان یہ ہے۔

وَلَدَارُ الْاٰخِرَۃِ خَیْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِیْنَ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَھَا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ لَھُمْ فِیْھَا مَا یَشَآءُوْنَ کَذٰلِکَ یَجْزِی اللّٰہُ الْمُتَّقِیْنَ۔ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْکُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّۃَ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۳۲/۱۶

اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے اور کیسا اچھا گھر ہے پرہیزگاروں کا ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں وہ داخل ہونگے جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی۔ ان میں جو کچھ وہ چاہیں گے ان کو وہ ملے گا۔ اسی طرح اللہ ان پرہیزگاروں کو بدلہ دیگا جن کی جانیں ملائکہ نے اس حالت میں قبض کی ہیں جبکہ وہ پاک تھے کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو اپنے عمل کے بدلے جنت میں جاؤ۔

دوسری آیت جس سے لوگوں کو عذاب برزخ کا خیال ہوا ہے یہ ہے۔

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْھَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَۃُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ۔ ۴۶/۴۰

اور آل فرعون کو برے عذاب آگ نے گھیر لیا جس پر وہ صبح اور شام پیش کیے جائینگے اور قیامت کے دن کہا جائیگا کہ) آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں ڈال دو۔

آیت کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ آل فرعون غرق ہونے کے بعد روزانہ صبح اور شام آگ پر پیش کیے

جاتے ہیں یہ عذاب برزخ ہے پھر جب قیامت کا دن ہوگا تو فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ ان کو سخت ترین عذاب میں داخل کر دو۔

یہ مفہوم ان تمام قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے جو پہلے بدلائل بیان کر دی گئی ہیں۔ کیونکہ اگر برزخ میں آل فرعون روزانہ صبح اور شام کو آگ پر پیش کیے جاتے ہیں تو ان میں زندگی اور عذاب کی اثر پذیری کی صلاحیت یعنے شعور واحساس بھی ہونا چاہیے جس سے قرآن تصریحاً انکاری ہے۔ اور قرآنی تعلیمات میں اختلاف ہو نہیں سکتا۔ یہ دراصل ساری خرابی اس وجہ سے ہے کہ "یُعْرَضُوْنَ" کے معنے یہاں حال کے لیے گئے ہیں۔ یعنی وہ پیش کیے جاتے ہیں"۔ حالانکہ یہاں اس کے معنی استقبال کے ہیں۔ کیونکہ کفار جن میں آل فرعون بھی شامل ہیں ان کی آگ پر پیشی قیامت ہی کے دن ہوگی۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا - ۴۶/۲۰ اور جس دن کفار آگ پر پیش کیے جائیں گے (ان سے کہا جائیگا) کہ تم اپنی لذتیں اپنی دنیاوی زندگی میں اٹھا چکے

اس سے ثابت ہوگیا کہ آگ پر پیشی دوسری زندگی میں ہوگی جو حشر کے دن ملے گی چنانچہ سورہ ہود میں اس کی تصریح موجود ہے۔

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۱۱/۹۸ فرعون اپنی قوم کے آگے آگے آئیگا قیامت کے دن اور انکو آگ میں اتارے گا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ برزخ کا غیر زمانی ہونا ہم ثابت کر چکے ہیں اس میں نہ صبح ہے نہ شام اور اس آیت میں "غُدُوًّا وَعَشِيًّا" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح جنت کے لیے "بُكْرَةً وَعَشِيًّا" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی مفسرین اور اہل لغت نے دوام کے لکھے ہیں۔

وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۱۹/۶۲ اور جنتیوں کو ان کی روزی اس میں صبح اور شام ملتی رہے گی

جو صبح اور شام جنت میں ہے وہی دوزخ میں ہوگی خواہ اس کے معنی دوام کے لیے جائیں یا کچھ اور

اب اس طرح آیت کا دوسرا حصہ پہلے حصہ کی تشریح ہوگا۔ یعنے آل فرعون کو آگ کا دائمی عذاب جو دیا جائیگا وہ اس طرح ہوگا کہ فرشتوں کو حکم ملے گا کہ ان کو سخت عذاب میں ڈالدو۔

وَاَتْبَعْنَاهُمْ فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ هُمْ مِنَ الْمَقْبُوحِيْنَ ۔ ۴۲/۲۸ اور ہم نے اس دنیا میں آل فرعون کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے دن وہ برے حال میں ہوں گے۔

دنیا میں ان کے ملعون اور قیامت میں مقبوح ہونے کی تصریح کی گئی ہے مگر برزخ کا نام نہیں لیا گیا۔ اصلیت یہ ہے کہ قرآن کریم میں جابجا موت کے ساتھ ہی ساتھ عذاب یا ثواب کا ذکر جو آتا ہے وہ قیامت کے دن کا عذاب یا ثواب ہے برزخ کا نہیں ہے کیونکہ موت اور قیامت میں مردوں کے لحاظ سے فصل ہی نہیں ہے۔ لوگوں کی نظر چونکہ اس نکتہ پر نہ تھی اس وجہ سے انہوں نے عام اعتقاد کے مطابق اس عذاب یا ثواب کو موت کے بعد یعنی برزخ کا سمجھ لیا۔

جو حال آل فرعون کا ہے بعینہٖ وہی حال قوم نوح کا ہے یعنی وہ بھی قیامت ہی کے دن آگ میں داخل کیے جائیں گے۔

اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۲۵/۷۱ وہ غرق کیے گئے اور آگ میں داخل کر دیے گئے۔

کیونکہ سورۂ ابراہیم میں قوم نوح۔ عاد۔ اور ثمود وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد جنہوں نے انبیاء و رسل کا انکار کر دیا تھا۔ ان کے عذاب کے متعلق اللہ فرماتا ہے۔

وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ مِّنْ وَّرَائِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّاءٍ صَدِيْدٍ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۱۶/۱۴ اور ناکام رہا ہر سرکش ظالم۔ اس کے آگے جہنم ہے جس میں اس کو پیپ کا پانی پلادیا جائیگا۔ وہ اس کو گھونٹ گھونٹ پیے گا۔ اور گلے سے اتار نہ سکے گا۔ اور اس پر ہر طرف سے موت آئے گی مگر وہ مرنے والا نہیں۔

یعنی ان اقوام کو جہنم میں عذاب ملے گا جو قیامت کے دن سامنے لائی جائے گی۔ وعرضنا جہنم

يَوْمَئِذٍ لِّلْكَافِرِينَ ؛ اور اسی دن جہنم کو ہم کافروں کے سامنے لائیں گے۔ یہی وہ زندگی ہے جس میں موت نہ ہوگی۔

یہاں یہ بھی ذکر کر دینا ضروری ہے کہ قرآن میں جنت کے ثواب اور جہنم کے عذاب کے متعلق جا بجا ماضی ہی کے صیغے استعمال کیے گئے ہیں کیونکہ اللہ جو زمانہ سے بری ہے اس کے سامنے یہ سب واقعات حاضر ہیں۔ مثلاً حشر کے متعلق ہے۔

وَبَرَزُوا لِلَّهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا ۲۱/۱۴ — اور وہ سب اللہ کے سامنے حاضر ہوئے اور کمزوروں نے ان لوگوں سے کہا جو بڑے بنتے تھے۔

یا جہنمیوں کے بارے میں ہے۔

فَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّن نَّارٍ ۲۲/۱۹ — جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے کپڑے ترشوائے گئے۔

یا جنتیوں کے متعلق ہے۔

فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ — جنتیوں میں سے ایک نے دوسرے کی طرف سوال کرتے ہوئے

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ۳۷/۵۱ — رخ کیا۔ ایک کہنے والے نے کہا کہ میرا (دنیا میں) ایک ساتھی تھا۔

اس لیے قوم نوح کے متعلق "قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ" میں جو ماضی کے صیغے مستعمل ہوئے ہیں یہ قیامت کے دن کے لیے ہیں کیونکہ دوسرے مقامات میں فیصلہ حساب وکتاب اور عذاب و ثواب کے دن کی تصریح کر دی ہے کہ وہ یوم الحشر ہے۔ لہٰذا ماضی کے صیغوں سے استدلال صحیح نہیں۔

تیسری آیت جو برزخ کے عذاب کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے یہ ہے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ — اور تو دیکھتا جب یہ ظالم موت کے سکرات میں ہوتے ہیں اور

وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنفُسَكُمُ — اور فرشتے اپنا ہاتھ پھیلائے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنی جانیں

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ـ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۹۴/۶	نکال دو آج کے دن تمکو ذلت کا عذاب دیا جائیگا۔ اس لیے کہ تم اللہ پر جھوٹ بولتے تھے۔ اور تم ہمارے پاس اکیلے آئے جس طرح کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا اس کو پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھتے جن کی بابت تم گمان رکھتے تھے کہ تمہارے امور میں وہ ہمارے ساجھی ہیں۔

اس آیت میں الیوم کے لفظ سے لوگوں نے سمجھا ہے کہ یہ برزخ کا عذاب ہے مگر جب یہ ثابت ہو چکا کہ برزخ غیر زمانی ہے اور موت اور قیامت کے دن میں مردوں کے لحاظ سے فصل نہیں، تو یہ آج یعنی موت کا دن بعینہٖ قیامت کا دن ہے۔ چنانچہ آیت میں "اوّل مرّۃٍ" (جیسا کہ ہم نے تمکو پہلی بار پیدا کیا تھا)، کا لفظ صاف تصریح کر رہا ہے کہ یہ حیات اُخروی کا واقعہ ہے۔ دوسری جگہ اسی آیت کے ساتھ حشر کی تصریح کر دی گئی۔

وَحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۴۸/۱۸	اور ہم ان کو حشر میں اٹھائیں گے اور ان میں سے ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے اور وہ صف بستہ تیرے رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور (ان سے کہا جائیگا) کہ تم ہمارے پاس اکیلے آئے جسطرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔

اس میں باوجود اس کے کہ سارے صیغے ماضی کے مستعمل ہوئے ہیں تصریح کی گئی ہے کہ یہ سوال وجواب حشر کے دن کا ہے۔

اس موقع پر یہ ذکر بھی اہل علم کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ رسالۂ معارف کے مدیر شہیر نے

آیتہ مذکورہ کے متعلق میرے جواب میں لکھا ہے کہ :-

"اس آیت میں تصریح ہے کہ موت کے وقت یہ سوال ہوتا ہے۔ قیامت کے دن کا بیان نام نہیں۔ یہ اس وقت کا حال ہے جب خدا کے سامنے ایک ایک کرکے لوگ آتے ہیں جس طرح ایک ایک کرکے پیدا ہوئے ہیں قیامت کے دن لوگ اکٹھے ہو کر خدا کے سامنے جائیں گے۔ اس لیے یہ موت کے وقت کا حال ہے۔ نہ کہ قیامت کا" رسالہ معارف اعظم گڈھ۔ مئی ۱۹۳۴ء صفحہ ۳۵۶۔

مدیر معارف کے استدلال کی بنیاد "فرادیٰ" کے لفظ پر ہے۔ انکا خیال یہ ہے کہ ایک ایک کرکے لوگ برزخ میں جاتے ہیں اور قیامت کے دن ایک ایک کرکے نہیں جائیں گے بلکہ جھنڈ کے جھنڈ جائیں گے اس لیئے اس لفظ سے ظاہر ہو گیا کہ یہ برزخ کا عذاب ہے۔ غالباً انہوں نے قرآن میں قیامت کے دن کے متعلق صرف یہی دیکھا ہے کہ۔ فَتَأْتُوْنَ اَفْوَاجًا۔ یعنے تم جھنڈ کے جھنڈ آؤگے اور اس پر نظر نہیں پڑی کہ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا $\frac{96}{19}$ ان میں سے ہر ایک اللہ کے پاس قیامت کے دن اکیلا آئیگا "فرادیٰ" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اکیلے آئینگے نہ ان کے ساتھ مال و اولاد ہوگی نہ اعوان و انصار جیساکہ تفصیل کے ساتھ ہم نے اس کو اپنی کتاب تعلیمات قرآن میں بیان کر دیا ہے۔ اور "افواجا" سے مراد یہ ہے کہ سب ساتھ مل کر آئینگے۔

ترجمان القرآن۔ جناب مولانا اسلم جیراج پوری کا یہ مضمون تبصرے کا متقاضی ہے مگر جگہ کی قلت کے سبب سے تبصرہ اس کے ساتھ شائع نہ کیا جا سکا۔ انشاءاللہ آئندہ اشاعت میں اس پر مختصراً اظہار رائے کیا جائیگا۔

رسائل و مسائل

تعلیمات قرآن کے متعلق بحث

(۲)

از جناب چودہری غلام احمد صاحب پرویز بی۔ اے

مفہوم خلافت اس میں کوئی کلام نہیں کہ حضرت انسان کو اللہ تعالیٰ نے تمام موجودات عالم پر تشریف و تکریم سے سرفراز فرمایا ہے۔ (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ) اور جملہ مخلوقات اس کے تابع فرمان بنائی ہیں۔ (وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا)۔ اور اس اعتبار سے انسان کو جملہ کائنات پر ایک خاص تفوق و برتری حاصل ہے۔ لیکن چونکہ اس تفوق کے خیال سے ذہن انسانی میں خود مالک و مختار بن بیٹھنے کا امکان ہے، اس لیے آپ اس خطرہ کو اس طرح سے دور کرتے ہیں کہ انسان بلاشبہ ہر شئے پر حاکم و ذی اقتدار ہے لیکن خدا کا نائب ہونے کی حیثیت سے نہ کہ خود مالک ہونے کے اعتبار سے یعنی ان اشیاء میں تصرف وہ اپنے اختیار و ارادے سے نہیں کر سکتا بلکہ ان قوانین کے ماتحت کر سکتا ہے جو اس کے حاکم اعلیٰ کی طرف سے اسے ملیں جس کا وہ نائب ہے لیکن شاید آپ نے غور نہیں فرمایا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنے مقابلہ میں انسان کو مخاطب کیا ہے، وہاں لفظ عبد استعمال کیا ہے جس کے معنی بندہ و غلام کے ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جو خطرہ آپ انسان کو نائب کی حیثیت دیکر مٹانا چاہتے تھے، قرآن کریم نے اسے عبد کی حیثیت دیکر اس سے کہیں زیادہ مضبوط دیواروں سے اس کا سدباب کیا ہے۔ یعنی تمام مخلوقات کا حاکم، لیکن خدا کا غلام۔ اور اس کی سند ہمیں قرآن کریم سے صاف صاف ملتی ہے۔ برعکس اس کے خلیفۃ اللہ کے لیے بڑی دقت یہ پیش آتی ہے کہ قرآن کریم میں خلافت آدم کی نسبت کہیں اللہ کی طرف نہیں کی گئی۔ اور نیابت کا تو لفظ ہی کہیں قرآن میں آدم کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ اور اس میں

شبہ نہیں کہ نیابت کے مفہوم میں ذہن اس طرف ضرور منتقل ہوجاتا ہے جس کا صاحب تعلیمات نے ذکر کیا ہے خلافت کا مفہوم قرآن کریم میں ایک کی جگہ دوسرے کو جانشین بنانے کا ہی ہے۔ اور میں نے تو جہاں تک غور کیا ہے، جہاں جہاں یہ لفظ کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت کے متعلق استعمال ہوا ہے، اس جانشینی میں حکومت و سلطنت کا انتقال ضرور شامل ہے۔ چنانچہ جو آیات آپ نے نقل کی ہیں خود ان سے بھی یہی مفہوم ثابت ہوتا ہے جو آپ کے مدعا کے خلاف ہے۔ مثلاً آپ نے لکھا ہے۔

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ — قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمنوں کو ہلاک کردے
وَیَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ (۷:۱۵) — اور تم کو زمین میں جانشین (خلیفہ) فرمائے۔

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد فرعونیوں کو ہلاک کرکے تم کو ان کا جانشین بنا دیگا یعنی ملک و حکومت ان کی ہلاکت کے بعد ان سے چھن کر ان کو مل جائیگی چنانچہ یہی ہوا۔

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ وَّكُنُوْزٍ — سو ہم نے ان کو باغوں چشموں اور خزانوں اور عزت
وَّمَقَامٍ كَرِیْمٍ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا — والے مقامات سے نکال دیا اور ایسا ہی ہوا۔
بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ۔ (۲۶:۴) — اور ان سب کا وارث ہم نے بنی اسرائیل کو بنا دیا۔

اس سے صاف واضح ہے کہ یہاں استخلاف فی الارض سے مراد جانشینی ہے نہ کہ نیابت بنی اسرائیل فرعون کی ملک و حکومت کے وارث (اورثنا ہا) و جانشین بنائے گئے تھے۔ دوسری آیت آپ نے یہ لکھی ہے۔

وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ — اور میرا رب تمہارے سوا کسی دوسری قوم کو خلیفہ بنا دیگا
شَیْـًٔا۔ (۱۱:۵)۔ — اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔

یہ حضرت ہود کا خطاب ہے اپنی قوم سے جس کو اللہ تعالیٰ نے قوم نوحؑ کے بعد زمین کی بادشاہت دی تھی۔ چنانچہ حضرت ہود فرماتے ہیں۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (۹:۷) اور یاد کرو جب اللہ نے قوم نوح کے بعد تم کو خلیفہ بنایا

پھر جب قوم ہودؑ نے نافرمانی کی اور عذاب الٰہی سے ہلاک کیے گئے تو قوم ثمود ان کی جانشین

ہوئی جس کو مخاطب کرکے حضرت صالحؑ فرماتے ہیں۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ اور یاد کرو جب اللہ نے تم کو قوم عاد کے بعد جانشین

وَبَوَّاَكُمْ فِى الْاَرْضِ (۷:۱۰) بنایا اور تمہیں زمین میں متمکن کیا۔

یہی مفہوم اس آیت میں ہے جس کے الفاظ، جہاں تک جانشین اور نیابت کا تعلق ہے بالکل واضح ہیں

وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا (۹:۶) اور تمہاری جگہ دوسری قوم کو بدلدیگا اور تم اس کو ضرر نہ پہنچا سکو گے

اور اس آیت میں تو استخلاف کا مفہوم اور بھی زیادہ واضح ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ اگر اللہ چاہے تو تم کو لے جائے اور تمہارے بعد جس کو

مَا يَشَآءُ (۶:۱۶) چاہے جانشین بنائے۔

اسی کی تفسیر دوسری آیت سے ہوتی ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ (۴:۱۹) اگر اللہ چاہے تو اے لوگو تم کو لے جائے اور دوسروں کو لے آئے

ان آیات سے ظاہر ہے کہ ایک قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے بعد، یا ان سے غلبہ و استیلاء

اور ملک و حکومت چھین لینے کے بعد (کہ قوموں کی زندگی میں یہ عذاب بھی درحقیقت مٹا دینے کے مرادف بلکہ

اس سے بھی زیادہ بلائے عظیم ہوتا ہے) کسی دوسری قوم کو ان کی جگہ مسلط و متمکن کرکے قوم ماسبق کا وارث و جانشین

بنا دینے کو استخلاف کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔ اور یہ جو آپ نے فرمایا ہے کہ "استخلاف کے معنی ہی اپنا خلیفہ بنانے" کے

ہیں تو قرآن کریم میں علاوہ آیات محولہ بالا اور مقامات سے بھی اس کے خلاف شہادت ملتی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ (حدید)

شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ تو اس وقت سامنے نہیں۔ شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے

"اور خرچ کرو اس چیز سے کہ کیا ہے تم کو جانشین پہلوں کا بیچ اس کے"

اب ظاہر ہے کہ جب مُستَخلَف کے معنی "پہلوں کا جانشین" ہے تو استخلاف کے معنی صرف "اپنا خلیفہ" ہی کس طرح ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مصرحہ صدر آیات "استخلاف" میں شاہ صاحب نے کہیں "اپنا خلیفہ" ترجمہ نہیں کیا۔

اب نفس خلیفہ کے معنی دیکھیے۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۱۰:۲) پھر ہم نے تم کو ان کے بعد زمین میں خلیفہ (جانشین) بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

کس کا جانشین (خلیفہ) بنایا؟ اس کی تصریح اس سے پہلی آیت میں ہے۔

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا (۱۰:۲) بہت سی نسلوں کو جب انہوں نے ظلم کیا تم سے پہلے ہلاک کر ڈالا ہے

یعنی ان ہلاک کردہ قوموں کی جگہ پر اس زمین میں ہم نے تم کو بادشاہت دی ہے کہ دیکھیں تم کیسے کام کرتے ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب منوب عنہ کا ذکر نہ ہو تو اس سے مقصود خلیفہ ماسبق یعنی پہلوں کا جانشین ہوتا ہے۔

پھر قرآن کریم میں ہے۔

وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ (۵:۳۴) اور جو کچھ تم خرچ کر ڈالتے ہو اللہ اس کی جگہ دوسرا مال ہم کو دیتا ہے

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ خلیفہ کے معنی جانشین یعنے Successor کے ہیں اور خلف کے معنی کسی کا جانشین ہونا (To succeed) اور استخلاف کے معنی کسی کا جانشین بنانا (To make successor) ہے اب ان تصریحات کی روشنی میں آیت "یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض" کو دیکھیے کہ جس سے آپ نے خلیفۃ یعنی میرا نائب (مراد لیا ہے) تو واضح ہو جائیگا کہ لفظ خلیفہ کے استعمال کے بعد "للذین کانوا من قبلک" یعنی اُن لوگوں کا جانشین کہ جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں کے اضافہ کی ضرورت نہیں رہتی کہ یہ مفہوم خلیفہ کے اندر موجود ہے جس کے معنی ہی (Successor) کسی ماسبق کا جانشین ہے۔ البتہ اگر مفہوم اس سے جدا گانہ لینا ہو یا منوب عنہ کسی ماسبق کے علاوہ کوئی اور ہو تو اس وقت اس اضافہ کی ضرورت پڑتی ہے

جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر تشریف لے جاتے وقت اپنی عدم موجودگی میں جب حضرت ہارونؑ کو "اپنا" جانشین بنایا تو فرمایا۔

وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي (۷:۷) اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ میری قوم میں جانشین (خلیفہ) ہو

اب ظاہر ہے کہ اگر تنہا خلیفہ کے معنی "میرا جانشین" ہوتا۔ تو اخلفنی میں یائے متکلم بڑھانا خلاف بلاغت تھا

امید ہے ان تصریحات۔ اور جو کچھ اس عنوان کے شروع میں گذارش کیا گیا ہے اس کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ خلیفہ فی الارض سے مراد زمین کی سلطنت و حکومت کی جانشینی ہے۔ نہ کہ اللہ تعالیٰ کی جانشینی کہ اُس قادر مطلق معبود کو فی الحقیقت کسی نائب کی ضرورت نہیں، کہ نائب ہمیشہ غائب کا ہوتا ہے، حاضر کا نہیں ہوتا۔

الجواب

ماہ گذشتہ کے پرچہ میں جناب پرویز کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے حقیقت جن پر جو بحث کی گئی تھی اس سے موصوف کو ایک شکایت پیدا ہوگئی ہے، لہٰذا اس دوسری قسط کا جواب عرض کرنے سے پہلے اس کو رفع کر دینا ضروری ہے۔ شکایت یہ ہے کہ میرے جواب کا انداز ایسا ہے جس سے لوگوں کو معترض کے متعلق یہ بدگمانی ہوسکتی ہے کہ وہ بھی اسی گروہ میں سے ہے جو قرآن مجید کے ارشادات کو دورِ جدید کے معقولات کی کسوٹی پر کستا ہے، اور حقیقت و صداقت کا معیار قرآن کو نہیں خود اپنی عقل اور اپنے اکتسابی علم کو سمجھتا ہے حالانکہ معترض خود اس گروہ پر اعتراض کرنے والوں میں سے ایک ہے اور اس کا مقصد اس بحث سے صرف قرآن مجید کے معانی کو سمجھنا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میرے جواب کا انداز اور اس کی ہمہ گیری جس سے ان کو شکایت پیدا ہوئی ہے درا صل ایک اور وجہ پر مبنی ہے اور اس کو یہاں وضاحت کے ساتھ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ نہ صرف

جناب پرویز بلکہ دوسرے حضرات بھی جو میرے پاس اکثر اپنے شبہات و اعتراضات بھیجتے رہتے ہیں، اس قسم کی بحثوں میں میرے مسلک کو سمجھ لیں اور آیندہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔

میرا قاعدہ یہ ہے کہ جب میں کسی معترض کے اعتراض پر بحث کرتا ہوں تو اس بحث میں میرا خطاب تنہا اس معترض یا اس کے گروہ کی طرف نہیں ہوتا، بلکہ میں اس کے اعتراض کو محض ایک محرّک قرار دیکر مسئلہ زیر بحث کے ان تمام پہلوؤں پر بیک وقت روشنی ڈال دینا چاہتا ہوں جن میں مسلمانوں کے مختلف گروہوں کو مختلف قسم کے شکوک لاحق ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ میں نے اس لیے اختیار کیا ہے کہ اگر ایک ایک شخص یا ایک ایک مذہب کی حد تک جواب کو محدود رکھا جائے تو ایک ہی مسئلہ پر کئی کئی مرتبہ بحث کرنی پڑے گی جس سے میرا اور عام ناظرین کا بہت وقت ضائع ہوگا۔ علاوہ بریں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ معترض جس گروہ سے تعلق رکھتا ہے وہ قلیل التعداد ہوتا ہے، اور ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے جو اس مسئلہ میں کسی دوسرے پہلو سے شکوک رکھتے ہیں مثلاً جنوں کے متعلق شکوک رکھنے والوں میں وہ لوگ بہت کم ہیں جو محض قرآن مجید کے کسی ارشاد یا بعض ارشادات کی بنا پر شک کرتے ہیں۔ برعکس اس کے کثیر تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے جن کے شکوک کی بنا دور جدید کے معقولات' یا ان اثرات پر ہے جو غیر ارادی طور پر ان معقولات کی عام اشاعت سے دلوں میں سرایت کر گئے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر تنہا چوہدری صاحب یا ان کی سی ذہنیت کے چند دوسرے حضرات تک خطاب محدود رہتا تو ان کثیر التعداد متشککین کے شکوک و شبہات بدستور باقی رہ جاتے پس افادہ عام کی خاطر یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معترض خاص کے جواب میں خطاب عام اور ہمہ گیر ہو تاکہ معترض اور اس کے گروہ کے علاوہ دوسرے گروہوں کے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس توضیح کے بعد میں امید کرتا ہوں کہ آیندہ کسی بحث کے دوران میں کوئی معترض تنہا اپنے آپ کو میرا مخاطب نہ سمجھے گا۔

آئیے اب ہم اپنے اصل بحث کی طرف رجوع کریں۔

مفہوم خلافت | خلافت کی بحث میں سب سے پہلے ہم کو لغت عرب کی توجہ کرنی چاہیے کہ قرآن کریم اسی لغت

میں اترا ہے اور الفاظ قرآنی کے صحیح معنی معلوم کرنے کے لیے اسی کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

لغوی تحقیق خلافت کے معنی لغت میں صرف جانشینی او رقائم مقامی کے نہیں ہیں، جیسا کہ آپ نے سمجھا ہے، بلکہ نیابت کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ امام راغب اصفہانی اپنی مفردات میں لکھتے ہیں۔

والخلافۃ نیابۃ عن الغیر اما لغیبۃ المنوب عنہ واما لموتہ واما لعجزہ و اما لتشریف المستخلف۔

خلافت کسی دوسرے کی نیابت ہے، خواہ منوب عنہ کی غیر موجودگی کے سبب سے ہو یا اس کی موت کے سبب سے یا اس کے عجز کے سبب سے یا اس شخص کو بزرگی عطا کرنے کے لیے جسے خلیفہ بنایا گیا ہے۔

لین (Lane) نے اپنی مدالقاموس (Arabic english lexicon) میں خلیفہ کے معنی (Successor) کے علاوہ (Vicegerent) کے بھی لکھے ہیں۔ خلافت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ منوب عنہ مرجائے یا غائب ہو۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ خَلَفَ فلانٌ فلانًا قَامَ بِالْاَمْرِ عنہٗ اما معہ و اما بعدہٗ۔ "فلاں شخص فلاں شخص کا خلیفہ ہوا یعنی اس کی طرف سے کارپرداز ہوا خواہ اس کے ساتھ یا اس کے بعد"۔

اس مادے سے جو ابواب مشتق ہوئے ہیں، ان کی خاصیتوں سے اس کے معنی میں بھی تغیر واقع ہوتا ہے۔ خَلَفَ خِلَافَۃً کے معنی خلیفہ ہونے یا بعد میں آنے یا پیچھے رہنے کے ہیں۔ خَلَفَہٗ خلافۃً کان خلیفتہٗ وبقی بَعْدَہٗ وجاءَ بعدہٗ۔ (تاج العروس) قرآن مجید میں ہے فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِھِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْکِتٰبَ (۷: ۲۱) یعنی اُن کے بعد ایسے ناخلف آئے یا ان کے جانشین ہوئے جو کتاب کے وارث ہوئے۔ وَقَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْہِ ھٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ (۷: ۱۷) اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تو میری قوم کے بعد میرا جانشین یا نائب ہو۔ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ بَعْدِیْ (۷: ۱۸)۔ "موسیٰ نے کہا کہ میرے بعد تم میرے بہت برے پس ماندہ رہے"۔ وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْکُمْ مَّلٰٓئِکَۃً فِی الْاَرْضِ

یَخْلُفُوْنَ (۴۳: ٦٠) اگر ہم چاہیں تو زمین میں تم میں سے ملائکہ پیدا کریں جو تمہاری جگہ آباد ہوں"

تخلف کے معنی پیچھے رہ جانے کے ہیں۔ مَا کَانَ لِاَھْلِ الْمَدِیْنَۃِ وَمَنْ حَوْلَھُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ یَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ (۹: ۱۵)

اَخْلَفَ کے معنی کھوئی ہوئی چیز واپس دینے یا دلانے یا اس کا بدل عطا کرنے کے ہیں۔ اخلف اللہ لک وعلیک خیرًا ای ابدلک بما ذھب عنک وعوضک عنہ (نہایہ ابن اثیر) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَھُوَ یُخْلِفُہٗ وَھُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ (۳۴: ۵) اور جو کچھ تم خرچ کرو گے تو خدا وہ تمہیں پھر واپس دیگا (یا اس کا بدل عطا کرے گا) اور وہ بہترین رازق ہے" حدیث میں ہے۔ تکفل اللہ للغازی ان یخلف نفقتہ۔ اللہ نے غازی کے لیے ذمہ لیا ہے کہ جو کچھ وہ خرچ کرے گا۔ اللہ اس کا بدل عطا کرے گا۔

خَلَّفَ اور اِسْتَخْلَفَ کے معنی اپنا خلیفہ بنانے کے ہیں۔ یقال خلف فلانًا اذا جعلہ خلیفتہ کاستخلفہ (تاج العروس) اِسْتَخْلَفَ کبھی اگر منوب عنہ کی تصریح نہ کی گئی ہو تو معنی یہ ہونگے کہ اپنا خلیفہ بنایا۔ استخلف فلانًا ای جعلہ خلیفتہ لہ اور اگر منوب عنہ کی تصریح ہو تو پھر معنی یہ ہونگے کہ اس شخص کا جانشین بنایا جس کا ذکر گیا ہے۔ استخلف فلانًا من فلانٍ ای جعلہ مکانہٗ (اقرب الموارد) پس جہاں قرآن مجید نے محض استخلاف کا ذکر کیا ہے اور مستخلف لہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا مثلًا لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ (۲۴: ۷) میں تو وہاں استخلاف کے معنی خلافت الٰہی سپرد کرنے کے ہونگے اور جہاں مستخلف لہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہاں معنی یہ ہوں گے کہ دوسرے کی جگہ یا دوسرے کے بعد خلیفہ بنایا لیکن یہ واضح رہے کہ جب کبھی پچھلے نائب کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا نائب مقرر کرنے کا ذکر کیا جائیگا تو اس میں دونوں مفہوم شامل ہوں گے یعنی اسکا یہ مفہوم بھی ہوگا کہ حاکم اعلیٰ نے فلاں شخص کو فلاں کا جانشین بنایا اور یہ بھی کہ اس نے فلاں شخص کو اپنا نائب مقرر کیا مثلًا اگر کہا جائے کہ استخلف الملک اللورڈ ارون بعد اللورڈ ریڈنگ فی ولایۃ الھند

تو اس کے یہ معنی بھی ہوں گے بادشاہ نے لارڈ ارون کو لارڈ ریڈنگ کے بعد اس کی جگہ ہندوستان کا وائسرائے بنایا اور یہ بھی ہوں گے کہ اس نے ارون کو ریڈنگ کے بعد ہندوستان کی ولایت میں اپنا وائسرائے مقرر کیا۔ ان دونوں مفہوموں میں کوئی تضاد و تناقض نہیں ہے کہ بیک وقت صادق نہ آسکیں پس اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ کا یہ مفہوم بھی ہے کہ خدا تمہاری جگہ دوسروں کو دیدیگا اور یہ بھی کہ خدا تمہاری جگہ دوسروں کو خلیفہ بنالیگا۔ جہاں تک لغت کا تعلق ہے، کوئی امر ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں مفہوم لینے میں مانع نہیں ہے۔

جَعَلَهٗ خَلِیْفَۃً کے معنی صرف خلیفہ بنانے کے ہیں خلیفہ کے معنی خواہ نائب کے ہوں یا جانشین کے دونوں صورتوں میں اس کا مفہوم ایک اضافی مفہوم ہے اور اس کا اتمام بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ کوئی مستخلف لہٗ اور منسوب عنہٗ بھی ہو، عام اس سے کہ مقدر ہو یا مذکور پس جس جگہ جعل خلیفہ کے ساتھ قرآن مجید نے مستخلف لہٗ کی تصریح کر دی ہے وہاں تو مفہوم واضح ہے، مثلاً وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ۔ (۷ : ۹) اور وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ (۷ : ۱۰) اور ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۰ : ۲) لیکن جہاں مستخلف لہٗ کی طرف قطعاً کوئی اشارہ نہیں ہے وہاں ایک مستخلف لہٗ مقدر ماننا پڑیگا مثلاً اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ (۳۸ : ۲) اور وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ (۲۷ : ۵) اور وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (۶ : ۲۰) اور اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (۲ : ۴) سوال یہ ہے کہ وہ مقدر کون ہے۔ اگر آپ پچھلی قوموں یا پچھلے بادشاہوں کو مقدر مانتے ہیں۔ تو قطع نظر اس کے کہ یہ ایک تکلف ہے بعض آیتوں میں یہ معنے کھپتے ہی نہیں مثال کے طور پر وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ میں خلفاء کو زمین کی طرف مضاف کیا گیا ہے جس کا لفظی ترجمہ زمین کے خلفاء ہے اس میں یہ معنے نکالنے کی کہاں گنجایش ہے کہ زمین پر پہلے جو لوگ متمکن تھے ان کے خلفاء پھر اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً کے معنی اگر یہ لیے جائیں کہ "میں پچھلے ساکنین ارض کا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں" تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہیں ان ساکنین ارض کا ذکر کیا ہے جن کی خلافت انسان کے

سپرد کی گئی ہے؟ اگر کیا ہے تو حوالہ پیش کیجیے۔ اگر نہیں کیا تو فرمائیے کہ ایسی صورت میں محض زبان اور ادب کے نقطۂ نظر سے اس فقرے کا یہ مفہوم زیادہ اقرب الی الفہم ہے کہ "میں پچھلے مجہول الحال ساکنین ارض کا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں" یا یہ کہ "میں زمین میں اپنا ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں"؟ اگر سامع صرف عربی جانتا ہو اور ان عقلی مقدمات سے نا آشنائے محض ہو جنہیں مولانا اسلم جیراجپوری نے ترتیب دے کر ایک نتیجہ اخذ کیا ہے، تو وہ اس فقرے کو سن کر ان دونوں معنوں میں سے کونسا معنی مراد لے گا؟

خلافت میں فرمانروائی کا مفہوم اس لغوی تحقیق کے بعد میں آپ کو دعوت دوں گا کہ آپ خلافت کے اس مفہوم پر غور کیجیے جس کو خود آپ نے اور مولانا اسلم جیراجپوری نے مراد لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ۔

خلیفہ فی الارض سے مراد زمین کی سلطنت و حکومت کی جانشینی ہے

مولانا اسلم جیراجپوری انی جاعل فی الارض خلیفۃ کا ترجمہ "میں زمین میں ایک بادشاہ بنانے والا ہوں" کرتے ہیں اور نوٹ میں لکھتے ہیں۔

"حضرت آدم اپنے سے پہلے ساکنان زمین کے بجائے بادشاہ بنائے گئے تھے"

غور فرمائیے کہ خلافت کے معنی تو محض جانشینی یا قائم مقامی یا بعد میں آنے کے ہیں۔ پھر اس میں بادشاہی اور فرمانروائی کا مفہوم کہاں سے آگیا؟ اگر نفس خلافت اس مفہوم سے خالی ہے اور یقیناً خالی ہے تو اس میں یہ مفہوم اس اعتبار ہی سے آسکتا ہے کہ خلیفہ کو خلافت کسی فرمانروا اور کسی سلطان سے ملی ہو۔ پھر جب انسان کو وہ خلافت ملی جس میں خود آپ کے اعتراف کے مطابق سلطنت و فرمانروائی کی جھلک ہے تو لا محالہ یہ ماننا پڑے گا کہ انسان جس کا خلیفہ ہوا وہ کوئی فرمانروا تھا۔ اب فرمائیے کہ کیا قرآن سے یا علمی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان سے پہلے زمین پر کوئی ایسی مخلوق تھی جس میں فرمانروائی کی شان تھی؟ فرمانروائی کے لیے یہ علم، حکمت، اختیار، ارادہ، قدرت وغیرہ صفات کا ہونا ضروری ہے کہ ان کے بغیر زمین اور اس کی موجودات پر فرمانروائی نہیں ہو سکتی۔ علمی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس کرۂ خاکی پر انسان سے پہلے

کوئی مخلوق ایسی موجود نہ تھی جو ان صفات سے متصف ہوتی ۔ اسی کی تصدیق قرآن بھی کرتا ہے وہ ہم کو بتاتا ہے کہ انسان سے پہلے خدا کی جو مخلوق سب سے افضل تھی یعنی ملائکہ (جن کو عباد مکرمون کہا گیا ہے) اس کا بھی یہ حال تھا کہ وہ علم اشیاء سے بے خبر تھی (ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ أَنْۢبِـُٔونِى بِأَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ إِن كُنتُمْ صٰدِقِينَ قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ (۲: ۴) اور ارادہ واختیار کی آزادی سے بالکل محروم تھی (لَّا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۶۶: ۱) دوسری مخلوق جن تھے، سو ان کے متعلق کوئی بات قرآن مجید نے ایسی بیان نہیں کی جس سے معلوم ہوتا ہو کہ ان کو زمین کی فرمانروائی حاصل تھی ۔ رہے حیوانات و نباتات و جمادات، تو ان کا حال آپ جانتے ہیں پھر آخر وہ کونسی مخلوق تھی جس کی خلافت، زمین کی فرمانروائی کے اعزاز کے ساتھ انسان کو حاصل ہوئی ؟

تاہم اگر مان لیا جائے کہ یہ پرانے ساکنین ارض ہی کی خلافت ہے اور وہ ساکنین ارض انسان سے پہلے زمین کے فرمانروا تھے، تو کیا وہ بالاصالت فرمانروا تھے، یا ان کی فرمانروائی بھی خلیفانہ تھی ؟ پہلی شق تو آپ اختیار نہیں کرسکتے ۔ کیونکہ اسلامی عقیدہ کی رو سے بالاصل اور بالذات فرمانروا صرف حق تعالیٰ ہے، اور اس کے سوا سب کی فرمانروائی محض عطائی ہے ۔ اب رہی دوسری شق تو اس کو اختیار کرنے کی صورت میں یا تو آپ کو خلافت در خلافت کا ایک لامتناہی سلسلہ ماننا پڑیگا ۔ یا پھر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ فرمانروائی کی شان خواہ یکے بعد دیگرے کتنے ہی خلفاء کو ملی ہو بہر حال اس کا سرچشمہ وہی ذات حق تعالیٰ ہے ۔ اور خلافت میں بادشاہی کی جھلک اسی وقت آسکتی ہے جبکہ وہ خلافت الٰہی ہو ۔

قرآنی اشارات | اب میں آپ کو ان قرآنی اشارات کی طرف توجہ دلاؤں گا جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو جس خلافت سے سرفراز کیا گیا ہے، وہ دراصل خلافت الٰہی ہے ۔

قرآن مجید کا بیان ہے کہ خدا نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا (لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ

فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (۹۵:۴) اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔ قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ (۳۸:۵) اس میں اپنی روح پھونکی۔ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲:۱) اس کو علم کی نعمت سے سرفراز کیا وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ (۲:۴) اس کے لیے زمین و آسمان کی چیزوں کو مسخر کر دیا وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (۴۵:۲) ان صفات کے ساتھ جب انسان کی تخلیق پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تو فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے آگے سجدہ کریں۔ سورہ صٓ کے آخر میں اس حکم کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ خاص طور پر قابل غور ہے۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ (۳۸:۵)

جب کہ تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں پس جب میں اس کو پورا بنا لوں اور اس کے اندر اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدہ میں گر جانا چنانچہ تمام ملائکہ نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے انکار اور استکبار کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابلیس کس چیز نے تجھے اس کو سجدہ کرنے سے منع کیا جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے تو نے آیا یہ استکبار کیا ہے یا تو واقعی بڑے لوگوں میں سے ہے؟ اس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے بنایا ہے۔ اس پر اللہ نے فرمایا کہ تو ہماری بارگاہ سے نکل جا کہ تو مردود ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم کو سجدہ کرنے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ نے

آدم کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا تھا۔ یعنی وہ قدرت وصنعت الٰہی کا مظہر اتم تھا، اور اس کے اندر خود اپنی روح کا کچھ حصہ پھونکا تھا، یعنی ایک محدود پیمانے پر اس میں وہ صفات پیدا کر دی تھیں جو بدرجۂ فوق التمام خود باری تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ اس شان اور ان صفات پر آدم کو پیدا کرنے کے بعد اعلان کیا گیا کہ ہم اس کو زمین میں خلیفہ بنانے والے ہیں جیسا کہ سورۂ بقرہ کے چوتھے رکوع میں ارشاد ہوا ہے۔ فرشتوں نے اس کے مقابلہ میں اپنے حقوق پیش کیے تو ان کے سامنے آدم کی سب سے افضل صفت یعنی علم کا مظاہرہ کرایا گیا۔ اور جب خلافت کیلیے اس کا استحقاق ثابت کر دیا گیا تو فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ اس کی خلافت تسلیم کرو اور علامتِ تسلیم کے طور پر اسے سجدہ کرو۔ تمام فرشتوں نے اسے تسلیم کیا اور سربسجود ہو گئے مگر شیطان نے اس کی خلافت ماننے سے انکار کیا، اس لیے اس کو راندۂ درگاہ کر دیا گیا۔

یہ تمام اشارات کیا ظاہر کر رہے ہیں؟ تمام مخلوقات پر انسان کی فضیلت کا اظہار کیا جاتا ہے، عام مقابلہ میں اس کی فضیلت ثابت کی جاتی ہے، بتایا جاتا ہے کہ وہ ہماری صفات کا مظہر اتم ہے، اور ہم نے اس میں اپنی روح کا کچھ حصہ پھونکا ہے حکم ہوتا ہے اور وہ بھی کس کو؟ فرشتوں کو کہ اس کو سجدہ کرو، ان سب باتوں کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم اس کو خلیفہ بنانے والے ہیں ان طیاریوں کے ساتھ جس خلیفہ کی خلافت کا اعلان کیا گیا، کیا وہ پرانے ساکنین ارض کا خلیفہ ہو سکتا تھا؟ اگر بات صرف اتنی تھی کہ پرانے بسنے والوں کی جگہ کسی دوسرے کو بسایا جا رہا تھا تو اس کے لیے فرشتوں کے سامنے خلافت کا اعلان کرنے، اور اس کی فضیلت کا مظاہرہ کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر ملائکہ کو یہ حکم کیوں دیا گیا کہ اس کرۂ خاکی کے نوآباد کار کو جو فقط دوسرے لوگوں کی جگہ لینے کے لیے جا رہا تھا، سجدہ کریں؟

خلافت الٰہی سے مراد کیا ہے

دوسری بات جو قرآن مجید میں ایک اور موقع پر ارشاد ہوئی ہے خلافت الٰہی کے مفہوم کو صاف روشنی ڈالتی ہے فرمایا کہ:۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ   ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر

وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳ ۔ ۹)

پیش کیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے' اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ بے شک وہ ظالم اور انجام سے بے خبر تھا۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم اپنی مخلوقات میں سے کسی کو فرمانروائی کے کچھ اختیارات اور ذمہ داریاں تفویض کرنا چاہتے تھے۔ آسمانوں اور زمین میں جتنی مخلوقات تھیں انھوں نے زبان حال سے ظاہر کیا کہ وہ اس امانت کو اٹھانے کے اہل نہیں ہیں آخرکار انسان آیا اور اس نے یہ بار اٹھالیا اس سے متعدد نکات نکلتے ہیں۔

(۱) انسان سے پہلے زمین و آسمان میں جتنی مخلوقات تھیں ان میں سے کوئی بار امانت کا متحمل نہ تھا انسان پہلی مخلوق ہے جس نے امانت الٰہی کا بار اٹھایا لہٰذا منصب امانت میں وہ کسی مخلوق کا جانشین (Successor) نہیں ہے۔

(۲) جس چیز کو سورۂ بقر میں خلافت کہا گیا ہے وہ یہی امانت ہے کیونکہ وہاں فرشتوں پر ثابت کیا گیا تھا کہ تم خلافت کے اہل نہیں ہو' اس کا اہل انسان ہے اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی کوئی مخلوق ہماری امانت کا بار اٹھانے کی اہل نہ تھی۔ صرف انسان اس کا متحمل ہوا۔

(۳) خلافت کے مفہوم کو امانت کا لفظ واضح کر دیتا ہے، اور یہ دونوں لفظ، نظام عالم میں انسان کی صحیح حیثیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسان زمین کا فرمانروا ہے، مگر اس کی فرمانروائی بالاصالت نہیں ہے بلکہ تفویض کردہ (Delegated) ہے لہٰذا اللہ نے اس کے اختیارات مفوضہ (Delegatod powers) کو امانت سے تعبیر کیا ہے' اور اس حیثیت سے کہ اس کی طرف سے ان اختیارات مفوضہ کو استعمال کرتا ہے اسے خلیفہ (Vicegereut) کہا ہے جس کے اصطلاحی معنے یہ ہیں کہ وہ شخص جو کسی کے بخشے ہوئے اختیارات کو استعمال کرے Person exercising delegatod power

(باقی)

آپ کا کتب خانہ

کون کون سی کتابوں سے خالی ہے

اس کا جواب ان الماریوں سے ملے گا جن میں آپ کی کتابیں چنی ہوئی ہیں۔ نئی دنیا پرانے نظریوں کے متعلق کیا رائے رکھتی ہے اس کے مصنفین ہمارے سامنے کیا نئی باتیں پیش کر رہے ہیں۔ شاہراہ ترقی پر کون کس سے آگے ہے اور پہلے کہاں تھا؟ ان تمام سوالات کے جواب آپ کو اپنے کتبخانہ سے ملنے چاہئیں۔ مگر یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آپ اپنے ذخیرہ پر پوری توجہ رکھیں۔ آج آپ اسی نظر سے اپنے کتب خانہ کو دیکھیے اور اس میں جو کمی ہو اس کو پورا کرنے کے لیے ہمارے کتب خانہ کو لکھیے جہاں عربی فارسی اور خصوصاً اردو زبان کی تمام علمی، ادبی، تاریخی و فنی جدید و قدیم تصنیفات نہایت تلاش اور جستجو سے مہیا کی جاتی ہیں اور اکثر کمیاب قدیم تصانیف نہایت اہتمام سے خود طبع کرا کر پیش کی جاتی ہیں علاوہ بریں **درسی کتابیں** منظور شدہ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی از انفنٹ تا بی اے کلاس زبان عربی، فارسی، اردو، انگریزی، مرہٹی، تلگو، کنڑی وغیرہ نیز کنڈرگارٹن، ماڈل کے منٹ و نقشہ جات دیواری نیچرل ہر قسم کے چارٹس اسباق الاشیاء وغیرہ مدارس کے اور دیگر دفاتر کے فارمس اور ڈرائنگ کا سامان بالکل واجبی قیمتوں پر حاصل کیجیے۔

سید عبد القادر تاجر کتب

د ما لک اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز چار مینار حیدرآباد دکن

مکتبۂ علمیہ

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے۔ ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لیے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن بدر الدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع وناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی)

(مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن